مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں مسلم قومیت کا شعور

(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو

مقالہ نگار:

سید ذوالکفل حسین شاہ

رجسٹریشن:133-FLL/MSURDU/F14

نگران:

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء

مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں مسلم قومیت کا شعور

(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

مقالہ نگار:

سید ذوالکفل حسین شاہ

رجسٹریشن نمبر:133-FLL/MSURDU/F14

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

شعبہ اُردو، کلیۂ زبان وادب

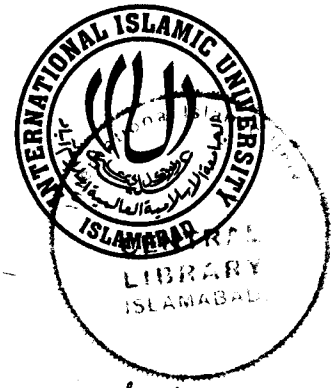

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء

Accession No. TH-23958

M S
89663919
ش ام

حالی، الطاف حسین ۔ 1837 - 1914
اردو ادب ۔ شاعری ۔ تحقیق و تنقید

اقرارنامہ

میں، سید ذوالکفل حسین شاہ حلفاً بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج) کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

(سید ذوالکفل حسین شاہ)

مقالہ نگار

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور **ایم ایس** اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں مسلم قومیت کا شعور (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)**

مقالہ نگار: سیّد ذوالکفل حسین شاہ

رجسٹریشن نمبر: 133-FLL/MSURDU/F14

کمیٹی دفاع مقالہ

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

پروفیسر ڈاکٹر ایاز افسر
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر سائرہ بتول
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر شفیق انجم
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
نمل، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ستمبر، 2020ء

تصدیق نامہ

سید ذوالکفل حسین شاہ نے رجسٹریشن:133-FLL/MSURDU/F14 کے تحت اپنا تحقیقی وتنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان '' **مولانا الطاف حسین حالؔی کی شاعری میں مسلم قومیت کا شعور**'' (**تحقیقی وتنقیدی جائزہ**) میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

یہ مقالہ تحقیقی وتنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بھجوادیا جائے۔

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

۶ جنوری ۲۰۲۵ء

فہرست ابواب

نام ابواب	صفحہ نمبر
پیش لفظ	V
باب اول: مسلم قومیت کا شعور و بنیادی مباحث	۱
باب دوم: مسلم قومیت کا تصور اور اردو ادب	۳۱
باب سوم: مولانا حالی اور ہندوستانی مسلم قومیت	۷۸
باب چہارم: مسدس حالی اور مسلم قومیت کا شعور	۹۴
باب پنجم مولانا الطاف حسین حالی کی نظموں میں مسلم قومیت کا شعور	۱۱۳
ماحصل	۱۳۷

پیش لفظ

اردو زبان وادب سے میری محبت اور دلی وابستگی کچھ فطری سی ہے۔شروع ہی سے اردو نہ صرف میرا پسندیدہ مضمون تھا بلکہ اردو میں لکھی جانے والی کہانیاں پڑھنے کا مجھے بے حد شوق تھا۔۲۰۱۰ء میں جب میں نے ایف۔اے کیا تو اس کے بعد مجھے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی سے بی۔ایس اردو کرنے کا موقع ملا، پھر خوش قسمتی سے ۲۰۱۴ء میں مجھے ایم۔ ایس اردو میں داخلہ مل گیا۔

ایم۔ایس اردو کا تحقیقی مقالہ لکھنے کا مرحلہ آیا تو میرے استادمحترم جناب ارشد محمود آصف (ارشد معراج) نے مجھے (مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں مسلم قومیت کا شعور) پر کام کرنے کو کہا۔مقالے کی تکمیل کا انحصار بروقت مواد کی فراہمی پر ہوتا ہے۔اس سلسلے میں مجھے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس سلسلے میں مختلف لائبریروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔سب سے زیادہ مواد ومعاونت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی لائبریری سے حاصل ہوئی اور دوسرے نمبر پر اپنی یونیورسٹی کی لائبریریوں سے ہوئی۔اس کے بعد میرے استادمحترم ڈاکٹر کامران عباس کاظمی نے متعلقہ مواد کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ اگر اُن کے پاس میرے مقالے کے حوالے سے مواد موجود ہوا تو فوراً اسے عنایت فرمایا۔

میں نے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں مسلم قومیت کا شعور بنیادی مباحث پر بات کی گئی ہے پھر قوم کا مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کے بعد مختلف قوموں کے نظریات اور مسلم قوم کے نظریے کی تشریح کی گئی ہے۔اس کے بعد سرسید اور مسلم قومیت پر بحث کی ہے کہ سرسید آحمد خان کس طرح کی مسلم قومیت بارے میں فکرمند تھے اور اُنہوں نے مسلم قوم کو ترقی کرنے کے لیے کیا سبق دیا۔اس کے بعد قرآن وحدیث کے حوالے سے مسلم قومیت کا تصور بیان کیا ہے کہ کس طرح اسلام نے مسلم قوم اور دیگر اقوام کا موازنہ کیا ہے۔

دوسرے باب میں مولانا الطاف حسین حالی اور ہندوستانی مسلم قومیت پر بحث کی گئی ہے کہ حالی کے دور میں مسلم قوم کی کیا حالت تھی اور وہ کتنے پریشان تھے کہ مسلم قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ سیاسی اعتبار سے مسلم قوم دیگر اقوام سے بہت پیچھے ہے اور جو حکمران ہیں وہ بھی مسلم قوم سے بدظن ہیں۔ان حالات میں حالی نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلم قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔اس کے بعد ہند اسلامی تہذیب پر بحث کی گئی ہے کہ ہندوستان میں کس طرح اسلامی تہذیب آئی اور اس نے یہاں کیا اثرات مرتب کیے اس کے بعد مسلم قومیت پر نوآبادیاتی ثقافتی اثرات کے حوالے سے بات کی ہے کہ نوآبادیاتی تمدن نے مسلم قومیت کی تہذیبی وثقافتی فضا کو شدید متاثر کیا تیسرے باب میں مسدسِ حالی اور مسلم قومیت کا شعور پر بحث کی گئی ہے کہ حالی نے اپنی مسدس کے ذریعے مسلم قوم کے عروج کی کہانی اور زوال کا مرثیہ مسلم قوم کو سنایا ہے۔اس نظم میں

حالی نے قومی مسائل کے بجائے صرف قومِ مسلم کو موضوع بنایا ہے۔ چوتھے باب میں مولانا الطاف حسین حالی کی موضوعاتی نظموں جن میں ''شکوہ ہند، حبِ وطن'' اور انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں پر بحث کی گئی ہے کہ کس طرح حالی اپنی قوم کے خیر خواہ ہیں اور وہ اُن کے لیے کیا سوچتے ہیں۔

تسویدِ مقالہ میں مجھے جن شخصیات کا خصوصی تعاون حاصل رہا، اُن کا ذکر نہ کرنا علمی و ادبی بد دیانتی کے مترادف ہو گا۔ میں سب سے پہلے ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج) کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف اپنی سرپرستی میں یہ تحقیقی کام کروانے کی عزت افزائی سے نوازا بلکہ اپنی گوناگوں مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میری ہر لمحہ مدد فرمائی۔ اس کے علاوہ میں اپنے اساتذہ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم) ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر روش ندیم، ڈاکٹر اسماعیل گوہر، ڈاکٹر کامران عباس کاظمی، ڈاکٹر مظہر علی طلعت کا انتہائی شکر گزار ہوں جن کی محبتوں، مفید مشوروں اور حوصلہ افزائی کی بدولت آج اپنے اس تحقیقی مقالے کو مکمل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔

آخر میں اپنے والدین اور باجی فاطمہ اور اپنی شریکِ حیات کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مشکل وقت میں مجھے حوصلہ دیا۔ میں اپنی تمام تر کامیابیوں کو ان کی دعاؤں کا ثمر سمجھتا ہوں۔

علاوہ ازیں اپنے تمام ہم جماعتوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں خصوصاً عادل بادشاہ، سہیل احمد جن کی سنگت اور محبت میرے لیے کسی بیش بہا خزانے سے کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے تمام دوستوں کا جن میں سید ماجد گردیزی، محمد اسحاق، شرافت حسین، محمود اقبال اور متین احمد کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس مشکل کام میں میرا ساتھ دیا۔

میں اس مقالے کی تکمیل میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ اہلِ فکر و دانش ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں بہر حال علمی و ادبی اعتبار سے کہیں کوئی بھی کمی یا تشنگی باقی رہ گئی ہو تو اسے میری تحقیقی کاوش سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔

سید ذوالکفل حسین

(ایم ایس اردو)

باب اول

مسلم قومیت کا شعور..... بنیادی مباحث

ا۔ مسلم قومیت:

انسان نے معاشرتی زندگی اختیار کی اور مختلف معاشرے وجود میں آئے تو اُس کے ساتھ مختلف معاشروں اور مختلف قومیتوں کا تصور بھی اُبھرا۔ قومیت کا یہ تصور اُن کی معاشرتی ثقافتی اور سیاسی زندگی پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔ دنیا کے مختلف معاشروں میں تاریخ کے مختلف ادوار میں کہیں ایک زبان بولنے والوں کو ایک قوم تسلیم کیا گیا تو کہیں ایک خطے میں رہنے والوں کو قوم قرار دیا گیا۔ نسلی اعتبار سے بھی قوم کی تشکیل ہوئی اور ایک مذہب کے پیروکاروں کو بھی ایک قوم تسلیم کیا گیا۔

اسلام کے حوالے سے عام طور پر مسلمانوں کو ایک قوم بھی کہا جاتا ہے اور اُمت بھی۔ مسلمان دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف اقوام کے لوگ مسلمان ہیں لیکن ایک مذہب کے پیروکار ہونے کی باعث اُن کو مسلم اُمہ کہا جاتا ہے۔ اسی امت سے تعلق رکھنے والوں کو عام طور پر قوم بھی کہا جاتا ہے۔ ذیل میں قومیت کے تصور کو تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

قوم کا مفہوم

انسان نے متمدن معاشرتی زندگی اختیار کی تو ان میں اشتراکِ عمل بھی پیدا ہوا باہمی تعاون ہی کے سہارے ایک معاشرہ آگے بڑھنے لگا۔ اس اشتراکِ عمل میں لوگوں کی بڑی تعداد داخل ہوئی۔ مشترک مفادات اور مشترک اشتراکِ عمل رکھنے والے لوگوں کو قوم کا نام دیا گیا۔ ایسے معاشرے میں جس میں عام طور پر نسلی لحاظ سے بھی قوم کے افراد ایک نسل سے تعلق رکھتے ہوں اُن کو بھی ایک قوم تسلیم کیا جاتا ہے

قوم کی اس ہیئت کی مثالیں قدیم بابل، مصر، روم اور یونان میں تھیں تو آج بھی جدید دنیا میں فرانس، انگلستان، جرمنی اور ٹلی میں قومیت کا تصور اُن ہی قدیم بنیادوں پر قائم ہے۔ (۱)

قومیت کے شعور کے بارے میں ڈاکٹر کامل قریشی لکھتے ہیں

قومیت کا موجودہ شعور اور تصور مغرب کی دین ہے۔ مخصوص جغرافیائی حدود میں بسنے والے عوام کو

کرنے کے لیے قومیت کے تصور نے جنم لیا(۲)

قومیت کی بنیاد میں یہ جذبہ اور خواہش شامل ہوتی ہے کہ مل کر ایک نصب العین کے تحت زندگی گزاری جائے۔ مشترک مفادات کی مشترکہ کوشش کی جائے ۔ اجتماعی ضروریات کے لیے اجتماعی کوششیں کی جائیں ۔قوم کو متحد رکھنے کے مقاصد کے تحت اجتماعی ضروریات اور مفادات کو مقدم رکھا جائے ۔قوم کے اتحاد کو اُن کی ترقی کا اصل نکتہ قرار دیا گیا۔مشترکہ مفادات کے خلاف کام کرنے والوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا اور اُن کے خلاف قوانین بھی بنائے گئے ۔قوم سے وابستگی کے جذبے نے قومی عصبیت کو بھی جنم دیا۔(۳)

قومیت کے عناصر

قوم کسی جامد شے کا نام نہیں بلکہ یہ ارتقا پذیر اور وسعت پذیر ہونے کے ساتھ زندہ و جاوید مشترکہ خوبیوں یا خامیوں کے مجموعے کا نام ہے۔

ایک فرد اپنی ذات کے علاوہ اپنے خاندان کا نمائندہ بھی ہوتا ہے،اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ کسی معاشرے کا نمائندہ کہلاتا ہے،یوں معاشرتی سطح پر اس کی پہچان ہوتی ہے،علاوہ ازیں اس کی نسل ،اس کا مذہب اور اس کا سیاسی و ملکی تعارف بھی اس کی شناخت کا باعث بنتا ہے،مختصراً اہل علم نے انسانوں کی قومیت میں تقسیم کو جن عناصر کو اہمیت دی ہے،ان کا اجمالی ذکر کر کے بات کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ انسانوں کے ایسے مجموعے کا نام ہیں جو کچھ قومیت کی تشکیل میں کچھ عناصر کام کرتے ہیں،جن میں ذیل کے تین عناصر اہم ہیں:

ا۔ نسلیت

دنیا میں انسان کی ایک بنیادی پہچان اس کا خاندانی تعارف بھی ہے،انسانی معاشری میں نسلی تعارف اسلام سے قبل ایک بری روایت سمجھا جاتا ہے، دور حاضر میں بھی انسانی تعارف اس کے نسل اور خاندان کے تناظر میں، معاشرے میں اس کی عزت ومنزلت کا باعث سمجھا جاتا ہے

ہندو معاشرے میں ذات پات کا نظام اس کی ایک بڑی مثال کت طور پر پیش کیاجا سکتا ہے۔ جہاں برہمن، کھشتر ی اور شودر کی تقسیم ایک ہی معاشرے میں بسنے والوں کو مختلف گرہوں میں تقسیم کرتی دکھائی دیتی ہے۔ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ عموماً ایک قوم کہلاتے ہیں ۔ یہ قومیت کا بہت قدیم اور زوردار تصور ہے ۔ نسل کی بنیادیں بہت گہری ہوتی ہیں ۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر فوقیت دیے جانے کے برعکس انسانی کردار اور تقویٰ کو معیار قرار دیا، اسلام کے واضح نصب العین کے باوجود آج دنیا میں رنگ و نسل کی غیر منصفانی تقسیم دوسرے مذاہب کی پہچان سمجھی جاتی ہے

ایک نسل کے لوگ ایک ہی قسم کے خدوخال ، رنگ، مزاج اور ثقافتی اقدار کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر ایک نسل کے لوگ ایک ہی خطے میں آباد ہوں تب بھی ایک قوم کہلاتے ہیں اور اگر مختلف خطوں میں آباد ہوں تب بھی ایک قوم تصور کی جاتی ہے، مثلاً سندھی اگر سندھ کے خطے میں آباد ہیں تو سندھی کہلاتے ہیں لیکن اگر سندھ سے نکل کر پاکستان کے کسی بھی دوسرے صوبے میں آباد ہو جائیں تو خود کو سندھی کہلاتے ہیں، قومیت کا یہ تصور قدرے محدود تصور ہے۔

۲۔ زبان

دنیا میں انسان کی ایک بنیادی پہچان اس کی اپنی زبان بھی ہے ،انسانوں اور جانوروں میں زبان کی بنیادی فرق ہے، اس کے علاوہ انسان کے حیوان ناطق کا لقب بھی دیا جاتا ہے، انسان دنیا کی وہ واحد مخلوق ہے جو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اپنی زبان کا سہارا لیتی ہے

چرند ، پرند، جانور اور دوسرے جاندار بھی زبان رکھتے ہیں مگر ان کی زبان کا دائرہ کار محدودیت کا شکار ہے، انسان اپنے جذبات کا اظہار زبان کے ذریعے کرتا ہے ،ایک وقت تھا جب انسانی زبان اشاروں ، کنایوں اور علامتوں پر مشتمل تھی، پھر انسانی آبادی تدریجی ارتقا کے تحت دنیا میں پھیلتی چلی گئی اور اس کی آبادی کے پھیلاؤ کے تناسب سے دنیا میں انسانی بستیاں مختلف ممالک میں تقسیم در تقسیم ہوتی چلی گئیں

یہ ایک فطری امر تھا کہ انسانوں کے مختلف ممالک میں بٹے ہوئے گروہوں نے اپنے اظہار کے لیے زبان کے مختلف اسلوب اپنائے جنھیں عرف عام میں ہم زبان کی اقسام کہتے ہیں، دنیا میں اس وقت جتنے ممالک ہیں ان میں ہر طرح کی زبان بولنے والے انسان آباد ہیں، دنیا کی بڑی زبانوں میں انگریزی، چینی زبان، عربی، فارسی، اردو، میواتی، ہسپانوی، فرانسیسی اور پنجابی زبانیں زیادہ بولی جاتی ہیں ۔یوں زبان کی تقسیم مختلف ممالک کا تعارف بھی بنتی چلی گئی۔

ایک زبان بولنے والوں کو بھی ایک قوم کہا جاتا ہے۔عربی بولنے واکے دنیا کے جن ممالک میں آباد ہیں اُنہیں عرب قوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ایک زبان اُن کی قومی شناخت بن گئی ہے ۔مختلف ممالک کی عربی میں اگر چہ لہجوں کا کافی فرق ہے ثقافتی اقدار میں بھی کاری اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اِن ذیلی اختلافات کے باوجود عرب قوم کا تصور کافی پختہ اور مقبول ہے۔

۳۔ مذہب

دنیا میں اس وقت تقریباً چار سو کے قریب مذاہب قائم ہیں جو اپنے اپنے معتقدین کے ساتھ اس دنیا میں اپنی جداگانہ اور منفرد حیثیت بنائے ہوئے ہیں، ان مذاہب میں زیادہ مشہور مذاہب اسلام، عیسائیت، یہودی، پارسی، بدھ مت، ہندو اور سکھ مذہب شامل ہیں۔ایک مذہب کے پیروکاروں کو بھی ایک قوم کہا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں آباد کسی ایک مذہب کا پیروکار دنیا کے کے کسی دوسرے ہم مذہب کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی الگ پہچان کا باعث بھی سمجھتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے تمام مسلمانوں کو ایک جسم سے تشبیہ دیتے ہوئے مسلم قومیت کا آفاقی نظریہ عطا فرمایا، آپ ﷺ کے ارشاد مبارک کے مطابق دنیا میں تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں جس طرح جسم کے کسی ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی مسلمان کے دکھ درد کی شدت کا احساس دنیا بھر کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے

اس نظریے میں ایک قوم کا ایک ہی خطے میں آباد ہونا یا ایک زبان بولنا ضروری نہیں ہے بلکہ اُن کا ایک

مذہب کا پیروکار ہونا ضروری ہے۔ اُن کی زندگی کا نصبُ العین ایک مذہب کی بنیاد پر یکساں ہوتا ہے اور اُن کی اخلاقی اور ثقافتی قدریں ایک مذہب کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہیں۔ اُن کے عقائد ونظریات میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اُن کا نظریہ حیات مشترک ہوتا ہے۔ مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اُن کا اخلاقی نظام ایک جیسا ہوتا ہے اس لیے اُن کو ایک قوم کہا جاتا ہے

قومیت کا نظریہ قرآن کی نظر میں

اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے اور قیامت تک کے لیے قائم رہنے کی غریض سے اللہ کی جانب سے عطا کیا گیا ہے۔ اسلام جہاں زندگی کے فطری رجحانات کا بنیادی عکاس ہے وہیں وہ انسانی ضروریات ،معاملات،اور مشکلات میں مکمل اور جامع رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے،مذہب اسلام کا موضوع انسان ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام نوع انسانیت کے لیے ہدایت کے چراغ روشن ہیں ،مگر جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں ،اسلام انھیں دنیا و آخرت میں انفرادیت بھی عطا کرتا ہے،یہی وجہ ہے کہ اسلام دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم کے نام سے پکارتا ہے،قرآن کی آیات اس ضمن میں گواہ ہیں۔

اسلام مساوات کا مذہب ہے اور انسانوں میں انسانی حوالے سے برابری کا قائل ہے۔ انسانوں کے مختلف نسلی گروہوں،قوموں اور قبیلوں کی شناخت کو اسلام رد نہیں کرتا کیونکہ اس سے اُن کی شناخت اور تعارف ہوتا ہے لیکن نسلی،قومی اور علاقائی بنیادوں پر انسانوں میں اونچ نیچ کا حامی نہیں ہے۔ چونکہ سبھی انسان آدمؑ کی اولاد ہیں چنانچہ ایک ہی اولاد میں نسلی وقومی برتری کا تصور اسلام میں نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ:''لوگو!اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اُس کا جوڑا بنایا اور اُن دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیے'' سورت النساء آیت نمبر ا(۴)

دنیا بھر کے انسان دنیا کے مختلف براعظموں میں آباد ہیں۔ ہر خطے میں جداگانہ نسلیں اور قومیں آباد ہیں۔ اُن

کی نسلیت اور قومیت ایک دوسرے سے دور رہنے کے باعث، جغرافیائی حالات کے باعث اور مختلف زبانیں بولنے کے حوالے سے ہے۔ اس شناخت اور تعارف کو اسلام ردّ نہیں کرتا۔

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو'' سورت الحجرات آیت نمبر ۱۳(۵)

اسلام میں قومیت کا تصور مفقود نہیں ہے۔ ہر قوم کی تاریخ وثقافت اور زبان وادب اُس کے لیے اہم ہوتی ہے اور اسلام کسی قوم کی نسلی حیثیت اور تاریخی ولسانی ورثے کی قدر کرتا ہے۔ انصاف کے معاملے میں بھی دوسری اقوام کے ساتھ برابری کا درس دیتا ہے۔ اس حکم قومیت کا تصور خوب اُبھرتا ہے۔ قرآن میں خدا نے حکم دیا ہے کہ:

ترجمہ: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی قوم کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔'' سورت المائدہ آیت نمبر ۸(۶)

قومیت کا تصور احادیث کی روشنی میں:

حدیث مبارکہ بھی دراصل قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ قرآن میں انسانوں کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کرنے کی وجہ بتائی گئی ہے کہ تم انسان ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ قومیت تعارف اور پہچان کے لیے ہے احادیثِ مبارکہ میں بھی اس کی اہمیت کو ردّ نہیں کیا گیا، البتہ ایک آدم کی اولاد ہونے کے باعث خدا کے حضور سب برابر ہیں لیکن ایمان لانے والے اور نہ لانے والے دو علیحدہ علیحدہ گروہ ہیں

عربوں میں عرب اور عجم کی اصطلاح ایک لسانی اصطلاح تھی۔ عرب سے مراد عربی زبان بولنے والے قبیلے اور اقوام تھیں جبکہ عجم اُن اقوام کے لیے استعمال کیا گیا جو عربی نہیں بولتے تھے۔ یہ نام بھی عربوں نے دیا۔ عربی ایک نہایت وضیح اور بلیغ زبان ہے۔ اپنے ذخیرۂ الفاظ قواعد اور ادب کے لحاظ سے وسیع زبان ہے اور عرب اسی پر فخر کرتے

تھے۔ دیگر زبانیں بولنے والوں کو وہ عجم یعنی گونگے کہتے تھے۔ جب حضرت محمد ﷺ اسلام لے کر آئے تو آپ ﷺ کا تعلق بھی عرب سے تھا۔ قرآن کی زبان بھی عربی تھی تو اہلِ عرب اسی زبان پر اور اس کے بولنے پر فخر کرتے تھے اور اُن میں برتری کا شدید احساس ہو گیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے محض عربی زبان یا عرب نسل سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر کسی کی اہمیت اور برتری کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ خدا کے حضور برتری کا معیار تقویٰ ہے نہ کہ قومیت اور اس لیے خطبہ حجۃ الوداع میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے ہیں تم میں اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اُس سے زیادہ ڈرتا ہے(۷)

حضور اکرم ﷺ کے آخری خطبہ حج کے ان الفاظ سے ایک عالمگیر اسلام قومیت کا تصور واضح ہوتا ہے۔ عرب عجم سبھی جب دائرہِ اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو ایک وسیع قومیت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُن کا نظریہ حیات ایک ہو تا ہے۔ ایک ہی نظریہ حیات کے باعث اُن کا طرزِ زندگی یکساں ہوتا ہے۔ جدا جدا زبانیں بولنے اور جدا جدا تہذیب وثقافت کے باوجود اُن میں زندگی اور آخرت کا تصور ایک سا ہوتا ہے۔

دائرہِ اسلام میں داخل ہونے کے بعد کسی تہذیب، نسل اور زبان کا فرد اسلامی قومیت کا حصّہ بن سکتا ہے۔ البتہ اُس کی سابقہ قومیت اور شناخت کو نہ ردّ کیا جاتا ہے نہ ختم کیا جاتا ہے۔ اُس کی نسلی، لسانی یا جغرافیائی شناخت اُس کے تعارف کے طور پر قائم رہتی ہے۔ حضرت بلالؓ کو بلالِ حبشی اس لیے کہا جاتا تھا کہ اُن کا تعلق حبشہ سے تھا۔ یمنی، مصری، خراسانی سبھی تعارف کے لیے نسبتی نام ہیں۔

اسلامی تصورِ قومیت کو واضح کرتے ہوئے علامہ محمد اقبالؒ نے اسلامی قومیت اور مغربی قومیت کے تصورات کے فرق کو اپنے ان اشعار میں یوں نمایاں کیا ہے۔

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اُن کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار

قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری (۸)

وطنی یا نسلی قومیت کے احساسات پیدا ہونے کے بعد اسلامی قومیت کا رشتہ مسلمانوں کے درمیان باقی نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ دو قسم کی قومیتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتی ہیں۔ اسلامی قومیت کے احساس کا فطری مقتضا یہ ہے کہ وہ مسلم کو مسلم اور غیر مسلم کو غیر مسلم سمجھے۔

ب۔ سرسید احمد خان اور مسلم قومیت کا شعور

دین اسلام اللہ کا آخری دین ہے، جس کے پیروکار دنیا میں آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کے مقلد ہیں، حق وصداقت کا یہ راستہ جسے اسلام کے نام سے جانا جاتا ہے، ہر دور میں انسان کی رشد و ہدایت کا سرچشمہ رہا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ حق کے راست میں رکاوٹیں آتی ہیں، اور انسانوں کو ان کی غلطیوں کی سزا بھی ملتی ہے۔ ایک وقت تھا جب مسلمان دنیا کے زائد نصف پر حکمران تھے مگر اپنی سستی و کاہلی اور غیر مسلمانوں کی سازشوں کا شکار ہوتے ہوتے آج محکومیت کی عملی شکل بن چکے ہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان جسے ملک میں مسلمان ایک آزادانہ زندگی بسر کر رہے ہیں مگر بیشتر علوم، وسائل اور ایجادات غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلم ممالک بھی غیر مسلموں کے دست نگر ہیں، یہ صورت حال ۱۸۵۷ء سے پہلے زیادی گھمبیر نظر آتی ہے جب مسلمانوں کے مغلیہ اقتدار کا خاتمہ اور انگریزوں کے اس برصغیر پر قبضے کی صورت حال تاریخ کے اوراق میں نظر آتی ہے، ایسے میں مسلم قوم جہاں ایک طرف انگریزوں کی غلامی کا شکار ہو کر رہ گئی وہیں ہندوؤں کی سازشوں کا بھی شکار ہوتی نظر آئی ایسے میں مسلمان قوم کو ان کا ایک حقیقی رہنما میسر آیا جسے قوم سرسید احمد خان کے نام سے جانتی ہے۔

گزشتہ صدی میں برِعظیم نے جن باکمال لوگوں کو پیدا کیا، سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء-۱۸۹۷ء) اُن میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم اور جدید نظریہ تہذیب کے سب سے

بڑے مبلغ تھے ۔ اُن کے دور میں مسلم قوم بہت سارے مسائل کا شکار تھی ۔ مسلم قوم کا سب سے جو بڑا مسئلہ تھا وہ سیاست کا تھا۔ انگریز بھی مسلم قوم کو سیاست سے دور رکھنا چاہتا تھا کیونکہ مسلمان اگر پھر سیاست میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے ہیں تو انگریز کو اپنے اقتدار کا خطرہ تھا۔ اِن حالات کے اندر سرسید احمد خان نے مسلم قوم کے اندر سیاسی شعور بیدار کرنے کے لیے جس میدان میں سب سے اہم کردار ادا کیا وہ مذہب تھا کیونکہ مذہب مسلم قوم کو بہت عزیز تھا۔ سرسید احمد خان کا تصنیفی دور ساٹھ سال پر محیط ہے جس میں چوالیس سے زیادہ کتابیں تحریر کیں ۔ مولانا الطاف حسین حالی ان کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے ۔

پہلے دور (۱۸۵۷ء تک) میں سرسید احمد خان نے پندرہ کتابیں لکھیں جن میں چھے کتابیں مذہب پر ہیں ۔ دوسرے دور میں (۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء سفرِ انگلستان) میں انہوں نے آٹھ کتابیں لکھیں جن میں چار مذہب پر ہیں ۔ تیسرے دور میں سرسید احمد خان نے اکیس کتابیں لکھیں جن میں تیرہ کتابیں مذہب پر ہیں ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے چوالیس میں سے تیئیس کتابیں مذہب پر لکھیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مذہب کے ذریعے سے مسلم قوم کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا جا سکتا ہے ۔

سرسید احمد خان نے مسلم قوم کو اپنی پہچان کرانے میں بڑی محنت کی لیکن اس کے ساتھ اُن کا رفقا کا بھی بڑا حصّہ ہے جنہوں نے سرسید کا ساتھ دیا ۔ جن میں مولانا وحیدالدین سلیم ، مولانا عبدالحلیم شرر ، نواب صدر یار جنگ ، سر ضیا الدین ، صاحبزادہ آفتاب احمد خان ، مولوی عبدالحق ، مولانا طفیل احمد ، مولانا ظفر علی خان ، مولوی عزیز مرزا ، مولوی عنایت اللہ ، مولانا حسرت موہانی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تحریکِ علی گڑھ میں علمی اور مذہبی خدمات سرانجام دیں ۔

سرسید احمد عظیم محسنِ قوم تھے انہوں نے جب مسلمانوں کو پڑھنے کا مشورہ دیا تو اُن پر کفر کا فتویٰ اور کافروں کا ساتھی قرار دیا لیکن انہوں نے ہار نہ مانی اور سب کو سمجھا کر رہے کہ تعلیم مسلم قوم کے لیے کتنی ضروری ہے ۔ اسی لیے انہوں نے علی گڑھ جیسا ممتاز مسلم تعلیمی ادارہ قائم کیا اور مسلمانانِ ہند کے لیے وقف کر دیا ۔ سرسید ایسے صوفیا اور مولویوں کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

افسوس خدا ہاتھ نہ آیا جناب رسولِ خدا بھی موجود نہیں ورنہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر اُن کے سامنے لے

جاتا اور کہتا کہ اے خدا اور اے جناب رسولِ خدا محاسبہ کرو تم مجھ میں اور ان میں اور بتاؤ کہ تمہارا دوست دار کون ہے میں گنہگار یا یہ پرہیز گار، انشا اللہ تعالیٰ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہو کر رہے گا۔(۹)

سرسید احمد خان کے دل میں مسلم قوم کے لیے سچی ہمدردی اور دل سوزی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلم قوم کو پھر وہی عروج و رفعت حاصل ہو جو گزشتہ زمانے میں اُسے حاصل رہی ہے وہ موجودہ مسلم قوم کی حالت پر بڑے دکھ کا اظہار کرتے تھے وہ دورانِ خطاب مسلم قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے خونی حادثے نے مسلم قوم کی بے پناہ تباہی اور بربادی نے سرسید کے حساس دل کو جلا کر رکھ دیا تھا اور ان کا دل اپنی بدقسمت قوم کی تباہ حالت کو دیکھ کر سخت کڑھتا اور رنجیدہ ہوتا تھا۔ بعض لوگ اُنھیں کافر، ملحد، دہریہ، مرتد اور نہ معلوم کیا کیا کہتے تھے لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ وہ قوم کی خاطر ہر ہتک اور ذلت کو بخوشی برداشت کر لیتے تھے۔ سرسید کے دل میں حقیقی ہمدردی کا جو جذبہ مسلم قوم کے بارے میں تھا اُن کے ایک لیکچر سے ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے۔ سید فرماتے ہیں:

غدر (۱۸۵۷ء) کے بعد مجھ کو اپنے گھر کے لٹنے کا رنج تھا، نہ مال و اسباب کے تباہ ہونے کا جو کچھ رنج تھا وہ اپنی قوم کی بربادی کا رنج تھا۔ جب مسٹر شیکسپیئر نے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا (اور) میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق اس دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو میں اِن کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں، (اس لیے) میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بات بالکل سچ تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ

اس رنج نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدۂ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا تو اس غم کو اور ترقی ہوئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔نہیں، قوم کے ساتھ اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت (اس وقت قوم پر) پڑی ہے اس کے دور کرنے میں کمر ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ (پس اس فیصلے کے مطابق) میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا مگر (واقعی بات یہ ہے کہ) میں نے پسند نہیں کیا لیکن میں نہیں جانتا کہ کس نے پسند کیا اور کس نے (مجھے اس پر) آمادہ کیا ۔میں بیان کرنا نہیں چاہتا کہ وہ کیا وقت تھا اور اس قومی ہمدردی کے جوش سے جس کو میں دیوانہ پن کہہ سکتا ہوں، مجھ پر کیا گزرنے والا تھا۔ یہ میرا پہلا سبق قومی ہمدردی کا تھا۔'' (مجموعہ لیکچر ہائے سرسید ،مرتبہ منشی سراج الدین ،ص۳۔۴) (۱۰)

سرسید احمد خان مسلم قوم کی گزشتہ اور موجودہ حالت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسلام کی حالت مسلمانوں کی حالت سے دکھائی دیتی ہے اگر مسلم قوم کی حالت اچھی ہے تو اسلام کی حالت اچھی ہے اگر اُن کی حالت بری ہے تو اسلام کی حالت اچھی بھی نہیں ہے۔ مسلم قوم کی اچھی اور بری حالت کا ہونا دو امر سے متعلق ہے، ایک اخلاقی، دوسرے تمدنی یعنی دنیاوی۔

سرسید احمد خان مسلم قوم کی گذشتہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ہمارے اسلاف علم کی دنیا میں ،دولت اور حکومت میں، شان وشوکت میں اعلیٰ درجہ حاصل کیا تھا، جس کے سبب تمام قوموں میں معزز تھے اور اسلام کی شان اُن سے دکھائی دیتی تھی۔ اب ایک ہم ہیں کہ اپنے اسلاف کے نقشے سے ہٹ گئے ہیں۔ نہ ہمارے پاس علم ہے، نہ حکومت، نہ زر ہے، نہ زور ہے تمام قوموں سے ذلیل اور بدتر ہیں۔

سرسید اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ اگر جو شخص بہشت میں اپنے لیے ایک موتی محل بنانا چاہتا ہے وہ شخص قوم کے ساتھ ہمدردی کرے۔ اپنی قوم کو ذلیل حالت سے نکالے اس میں اُس کا بھی بھلا ہے اور قوم کا بھی بھلا ہے۔ اس

سے بڑھ کر اور نیکی کیا ہو سکتی ہے۔ سرسید اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے بھائیو! قوم کی موجودہ حالت تو تمھارے سامنے ہے، اس کی آیندہ حالت تمھارے ہاتھ میں ہے اگر تم فیاضی سے کرو گے، قوم کے ساتھ ہمدردی کرو گے، اس کی آیندہ حالت درست ہو جائے گی اگر بے پرواہی کرو گے، نفسانفسی میں پڑو گے، قوم کی حالت روز بروز ذلیل وخوار اور ابتر ہوتی جاوے گی مگر اے دوستو! میری بات سن لو۔ میں سچ کہتا ہوں، سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ میں نہایت دل سوزی سے تم کو سخت لفظوں میں سمجھاتا ہوں کہ اگر تم قوم کی بھلائی میں کوشش نہ کرو گے تو تمھاری آیندہ نسلیں اپنے اسلاف کو کوسیں گی اور خود تمھاری روحیں اپنی اولاد کی ذلت کی حالت میں دیکھ کر قبروں میں تڑپیں گی پھر وہ عذاب ان کو دوزخ کے عذاب سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوگا۔ برائے خدا سمجھو، اپنی جان پر، اپنی اولاد کی جان پر، اپنی روح پر رحم کرو اور قوم کی بھلائی پر متوجہ ہو۔(۱۱)

سرسید احمد خان مسلمان طلبا کو اسلام پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اگر تم اسلام پر قائم رہے تو تم بہت ترقی کرو گے اور مسلم قوم کی بھی۔

سرسید احمد خان کے مطابق مسلم قوم کا شاندار ماضی تھا اور اب اُن پر زوال آ گیا ہے لیکن کوئی بات نہیں اگر کوئی قوم اپنے ماضی کو نہ بھولے تو وہ قوم ترقی کر سکتی ہے۔ انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کے گیارھواں اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کہا۔

کہ وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جس کی گزشتہ زمانے کی تاریخ قابلِ یاد رکھنے کی ہو اور اُس کو یاد نہ ہو اور وہ قوم نہایت خوش نصیب ہے جس کی گزشتہ زمانے کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل ہو اور قوم نے اُسے یاد بھی رکھا ہو۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہماری قوم کی گزشتہ زمانے کی تاریخ یاد رہنے کے قابل ہے مگر دو وجہ سے میں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔۱۲

اول اس لیے کہ ہماری قوم کے تنزل کو ابھی کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا اور قوم کی تاریخ کی شان وشوکت کے نشان ہندوستان میں، عرب میں، ایشیا میں، افریقہ میں، یورپ میں سب جگہ موجود ہیں، ابھی تک مٹے نہیں۔

دوسرے یہ کہ جب کہ خود ہم نالائق ناخلف ہیں تو ہم کو اپنے بزرگوں کی شان وشوکت پر فخر کرنے اور استخوانِ جدفروش ہونے سے کیا فائدہ ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''ذکر جوانی اور پیری و ذکر تونگری درفقیری راست نیابد۔''

سرسید کے خیال کے مطابق قوم کی فلاح دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم پر زیادہ منحصر ہے وہ کہتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کو بہت تنزل ہو گیا ہے اور مذہبی پابندی بہت کچھ ہو گئی ہے اس کی ترقی سے قوم کی ترقی ہو گی اگر اس ترقی سے مراد روحانی ترقی ہے تو سرسید اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ عصری تعلیم مسلم قوم کے لیے نہایت ضروری ہے۔

> موجود تعلیم سے بلاشبہ ایک قسم کی دماغی تعلیم ہوتی ہے، خیالات کی درستی ہوتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ قوم تنزل کی حالت میں ہے اور اس کی ترقی کا خیال مثل ایک خواب کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جب اس قسم کے لوگ کثرت سے ملک میں پیدا ہو جاویں گے اور ان میں وہ خیالات، جن کا میں نے ذکر کیا، زیادہ مستحکم اور پختہ ہو جاویں گے تو قوم کی ترقی کی پہلی منزل طے ہو گی۔۱۳

سرسید احمد خان کے مطابق ابھی تک علوم وفنون حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہندوستان میں موجود ہی نہیں ہے ۔ چند یونیورسٹیاں ہیں جنھوں نے ہماری تعلیم کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور افسوس ہے کہ ہماری نالائقی سے ہماری تعلیم اُن کے قبضے میں چلی گئی ہے جو قومی اغراض کے لیے کافی نہیں ہے وہ کہتے ہیں۔

> افسوس یہ ہے کہ ہماری قوم میں ایسی لیاقت نہیں ہے کہ اس قومی ضرورت کو پورا کرے۔ پس بالفعل جو تعلیم ہوتی ہے اسی پر ہم کو یہ مجبوری صبر کرنا اور یونیورسٹیوں کی غلامی میں پڑا رہنا چاہیے۔۱۴

سرسید احمد خان مسلم قوم کے نوجوانوں کو خصوصاً مسلم طلبا کو اسلام پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کو اسلام سے کتنا لگاؤ ہے۔ اسلام جدید تعلیم سے منع نہیں کرتا ہے۔ اسلام کو قائم رکھ کر ترقی ہو سکتی ہے۔ وہ مسلم طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ اگر تم اسلام پر قائم رہے تو بہت ترقی کرو گے اور مسلم قوم کی بھی عزت ہوگی اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے مستفید ہوں گی۔ ۱۵

سرسید احمد خان کے خیال کے مطابق قوم کوئی چیز نہیں ہے، جب تک وہ قوم قوم نہ رہے۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ کے اندر داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے۔ جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تبھی تک وہ قوم ہیں۔ اسلام کو قائم رکھ کر ہماری قوم مسلم قوم ہے۔ اگر کوئی آسمان کا تارہ ہو جائے سرسید احمد خان کہتے ہیں؛ مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا، وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا

سرسید احمد خان صرف مردوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں پر بھی زور دیا تھا، وہ کہتے ہیں۔

عورتوں کی تعلیم، نیک اخلاق، نیک خصلت، خانہ داری کے امور، بزرگوں کا ادب، خاوند کی محبت، بچوں کی پرورش، مذہبی عقائد کا جاننا ہونی چاہیے۔ اس کا میں حامی ہوں، اس کے سوا اور کسی تعلیم سے بیزار ہوں۔ ۱۶

سرسید احمد خان اپنی قوم کی موجودہ حالت کو دیکھ نہایت رنجیدہ ہوتے تھے، وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلم قوم کو دوبارہ عروج حاصل ہو لیکن قوم کے اندر اتنی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں کہ اُن کو دور کرنے کے لیے بڑی محنت اور مشقت کرنا ہو گی ایک جلسے میں انہوں نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اے میرے پیارے ہم قومو! اگر میرے لفظ ناگوار گزرے ہوں تو معاف کرو۔ میرا دل اپنی قوم کی حالت پر نہایت جلتا ہے۔ میں ان کو ایسی خراب حالت میں دیکھ نہیں سکتا اور جو ٹھیک ٹھیک حال ہے، وہ نہایت دل سوزی اور ہمدردی اور دلی محبت سے سب کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس امید سے کہ ہماری قوم جاگے اور ہوشیار ہو اور اصلی عزت و دولت و حشمت میں پہنچے اور جس طرح کہ اس دنیا کی اور معزز قومیں معزز ہیں اسی طرح ہماری قوم بھی معزز ہو۔ (۱۷)

سرسید احمد خان آئندہ آنے والی مسلم قوم کے لیے بھی سخت فکر مند تھے۔ اگر اولاد کی اور قوم کی تعلیم و تربیت صحیح

طریقے سے نہ ہوسکی تو مسلم قوم کی آئندہ آنے والی نسل کا مستقبل ٹھیک نہیں ہوگا۔تعلیم وتربیت کو سرسید کمہار کے آوے کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے برتنوں کو ایک ترتیب کے ساتھ رکھتا ہے اور پھر ان کو پکاتا ہے یہی حال قوم کا ہے اگر قوم کو معمار اچھے مل جائیں تو قوم ترقی کرسکتی ہے۔

سرسید تمام ہندوستان کے رئیسوں کی اولاد کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ ہر شخص نے بقدر اپنی ہمت کے اپنی اولاد کی تربیت پر کوشش کی ہوگی مگر کسی ایک گھرانے کی بھی اولاد کا بتاؤ جس نے عمدہ تربیت پائی ہو سرسید اُس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ ہماری تعلیم قومی نہیں تھی۔سرسید بے علمی کو مفلسی کی ماں قرار دیتے ہیں۔جس قوم میں علم وہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کے باعث ہوتی ہے۔تم اپنی قوم کے حال پر غور کرو کہ یہ بدبخت دن آگئے ہیں۔ بڑے بڑے قدیمی خاندانوں سب گر پڑے ہیں۔تمام قوم پر مفلسی اور محتاجی اور قرض داری اور ذلت چھا گئی ہے اگر جیل خانوں میں خیال کرو گے تو مسلمانوں کو بلحاظ آبادی اور قوموں سے بہت زیادہ پاؤ گے، وہ کہتے ہیں۔

> اے عزیزو! اب اس سے زیادہ کون سی بدبختی اور بدنصیبی ہے جس کی مسلمانوں پر آنے کی تم راہ دیکھتے ہو۔کیا تمھارا دل اپنی قوم کی یہ خراب حالت دیکھ کر، جس سے ایمان کانپ جاتا ہے، نہیں جلتا؟ کیا تم کو اپنی قوم پر رحم نہیں آتا؟ کیا محبتِ قومی اور حبِ ایمانی ہماری قوم سے بالکل جاتی رہی کہ ہم سب اپنے گھروں میں خوش خوش بیٹھتے ہیں اور اپنی قوم کی بھلائی میں کچھ نہیں کرتے۔

سرسید احمد خان مسلمان طلبا کو اسلام پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔اگر تم اسلام پر قائم رہے تو تم بہت ترقی کرو گے اور مسلم قوم کی بھی عزت ہوگی اور آیندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے مستفید ہوں گی۔اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا سرسید کے نزدیک قومی بہبودی ہے۔

سرسید احمد خان قوم کے ایک ایک فرد سے کہتے ہیں کہ سب کو مل کر کوشش کرنی چاہیے کہ قوم کے اندر سے بددیانتی اور خودغرضی نہ ہو، کیونکہ اس قوم برباد ہوجائے گی، کیونکہ خودغرضی اور بددیانتی ایسی بیماری ہے جس قوم کے اندر یہ لگ جائے وہ قوم دنیا میں ذلیل وخوار ہو جاتی ہے، اس مسلم قوم کو اس بیماری سے بچنا چاہیے۔قوم کی بھلائی اور ترقی

کے لیے کوئی ذاتی غرض نہیں ہونی چاہیے، سرسید نوحؑ کی مثال دے کر مسلم قوم کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کو ڈوبتے ہوئے دیکھا اور کہا اے خدا تیری یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔ سقراط نے بھی قومی خدمات کے بدلے زہر کا پیالہ پیا تھا اور قوم نصیحت کرنا چاہتا تھا۔ سرسید کہتے ہیں کہ میں بھی اس لیے قوم کی خدمت کر رہا ہوں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے مگر سمجھ لو کہ قوم کی بھلائی چاہنے والے تو مر جاتے ہیں اور اُن کی کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں مگر خدا کی لعنت قوم پر باقی رہ جاتی ہے۔ سرسید کہتے ہیں: اے خدا!! اے خدا! تو میری قوم کے ساتھ ایسا مت کیجو۔ مجھ کو معاف کرو۔(۱۸)

سرسید احمد خان مسلم قوم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے۔ نہیں اُن میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سی نیک کام کرتے ہیں۔ کیسی کیسی عالی شان مسجدیں، کیسے کیسے عالی شان امام باڑے اور کیسی کیسی نفیس خانقائیں ہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں۔ ہر شہر اور قصبے کے لوگ اپنی استطاعت کے مطابق خیرات کرتے ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، حج و زیارت میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ کوئی ایسا کام جس میں اُن کی دانست میں مذہبی نیکی ہو، دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ سارے کام اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت میں اُن کو اس کا بدلہ ملے گا اور روزِ محشر ان کو ثواب حاصل ہوگا۔ سرسید کہتے ہیں کہ درحقیقت یہ سارے کام خودغرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں اس سے قوم کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ جب تک ہمارے دل میں یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں، وہ قوم کے لیے کریں نہ اپنے ثواب آخرت کے لیے، اس وقت تک قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔

سرسید احمد خان کے انگریز حکومت سے اچھے تعلقات تھے لیکن وہ ان تعلقات کو انگلش قوم کی خاطر نہیں بلکہ اپنی قوم اور ملک کی خاطر نبھا رہے تھے، وہ کہتے ہیں:

> مجھ سے زیادہ اس امر کی خواہش کسی کو نہ ہوگی کہ ہمارے حکمران قوم سے نجی تعلقات بہتر اور خوش گوار ہیں۔ وہ ہم سے رواداری اور محبت سے پیش آئیں اور ہم ان سے وفاداری اور خلوص کے ساتھ ملیں۔ وہ ہماری ضروریات اور مشکلات کا خیال رکھیں، ہم ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کریں۔ نہ وہ ہم

سے تعصب برتیں، نہ ہم اُن سے دشمنی کریں۔ وہ ہماری پوری پوری ہمدردی کریں، ہم اُن کی پوری پوری خدمت کریں۔ غرض وہ ہمارے ساتھ برادرانہ برتاؤ کریں، ہم اُن کے ساتھ برادرانہ سلوک کریں۔ نہ وہ اپنی برتری اور فوقیت ہم پر جتائیں، نہ ہم انھیں اپنا دشمن اور مخالف سمجھیں۔ ۱۹

سرسید احمد خان کی یہ خواہش انگلش قوم کی خاطر سے نہیں بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر سے تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں کی خوشامد اور چاپلوسی کریں بلکہ وہ اپنے ملک اور قوم کی بھلائی اور بہتری کے لیے یہ سب کچھ کر رہے تھے، کیونکہ اسی میں دونوں کا فائدہ ہے حکمران قوم کا بھی اور محکوم قوم کا بھی۔

سرسید احمد خان بہت افسوس اور لمبے تجربے کے یہ کہتے ہیں کہ میری یہ خواہش اور آرزو ابھی تک پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔

سرسید احمد خان نے مسلم قوم کی ترقی کے لیے یہ سوچا کہ ہم بھی ایسے ادارے بنائیں جن کے ذریعے انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جائے، اس کے لیے انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی جیسا ادارہ قائم کیا لیکن جلد ہی اُنہیں یہ احساس ہو گیا کہ اس قسم کے ادارے کتنی ہی چیزوں کا ترجمہ کیوں نہ کر لیں یہ اُس رفتار کا ساتھ نہیں دے سکیں گے، جس رفتار سے نیا علم مغرب میں پیدا ہو رہا ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ہندوستان میں پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ رائے قائم کہ کہ تراجم پر انحصار کرنے کے بجائے مسلمانوں میں مغربی علوم سے براہ راست فیض یاب ہونے کی استعداد پیدا کی جائے۔ اس لیے اُنہوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم سے براہ راست استفادے کی حکمت عملی اختیار کی۔

سرسید احمد خان کے ایک محبِّ قوم مسلمان ہونے میں کوئی شک نہیں، مسلمانوں کی محبت اُن کے دل میں انتہائی زیادہ تھی اور وہ مسلمانوں کے لیے بہت دردمند تھے۔ سرسید نے اس معاملے میں دو کام کیے۔ ایک تو بڑی عظیم کتاب لکھی اسبابِ بغاوتِ ہند اس میں انہوں نے انگریزوں کو بتایا کہ یہاں ہندوستان میں بغاوت کس طرح ہوئی اور اس کے اصل اسباب کیا تھے۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کو باغی مت سمجھا جائے، یہ بھی پُر امن شہریوں کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ دوسرا کام جو سرسید احمد

خان نے کیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس بات پر اُبھارا کہ وہ انگریزی پڑھیں اور انگریزی علوم حاصل کریں، اور انہیں متنبہ کیا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اُن کے ترقی کے مواقع کم ہو جائیں گے اور وہ مزید پستی میں گرتے چلے جائیں گے۔ لہذا وہ انگریزی علوم پڑھیں، انگریزی زبان سیکھیں، نئی سائنس سیکھیں۔

سرسید احمد خان مسلم قوم کے لیے ایسی تعلیم چاہتے تھے کہ جس کی وجہ سے مسلم قوم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شامل ہو سکے

سرسید احمد خان نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جو خدمات انجام دیں اُن کا ذکر کیے بغیر اس بات کو ختم کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اپنے انگلستان کے دورانِ قیام میں اُنہوں نے وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں جو ترقی دیکھی تھی اس سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے لیکن اُن کی دور بین نگاہوں سے وہاں کے عوام کی اخلاقی پستی اور مذہبی زوال بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ انہیں یہ سوچ کر پریشانی ہوتی تھی کہ انگریزی طرز کی یہ تعلیم کہیں ہندوستانی مسلمانوں پر بھی اس قسم کے اثرات نہ ڈالے۔

سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ میں اس لیے مسلمان نہیں ہوں کہ میں نے ایک مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی ہے بلکہ میں نے مذہب کے تمام پہلوؤں کا خوب مطالعہ کیا ہے اور اسلام مجھے ہر لحاظ سے بہتر اور قابلِ قبول مذہب نظر آتا ہے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ قرآن ہر چیلنج کا مقابلہ کر سکتا ہے اور ہر دور میں اپنی افادیت اور فوقیت ثابت کر سکتا ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر مسلم نوجوان شک وشبہات کے لمحات میں صرف قرآن کی طرف رجوع کریں تو وہ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ سرسید یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے مسلم نوجوانوں کو تھوڑی بہت رہنمائی کی ضرورت ہو گی۔ قرآن مجید کی قدیم تفسیریں چاہے وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں موجودہ حالات اور موجودہ مسائل کے لیے نہیں لکھی گئی تھیں۔

اُن کا خیال تھا کہ قرآنی تعلیمات اگر اُن کی صحیح تاویل کر دی جائے تو وہ آج کے مسائل بھی حل کر سکتی ہیں۔ اسی لیے اُنہوں نے قرآن کی ایک نئی تفسیر خود لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ اُس تفسیر کا نام تفسیر القرآن ہے اور یہ سرسید کی آخری تصنیف تھی۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے ان پختہ خیالات و رجحانات کی ترجمان ہے جن تک سرسید احمد خان اپنی آخری

عمر میں پہنچ کر قائم ہو گئے تھے۔ اس تفسیر میں روایات سے بغاوت اپنی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس تفسیر میں سرسید نے قرآن مجید کے جغرافیائی اور تاریخی عقدوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تفسیر میں سرسید نے کوئی اتنی علمی مباحث نہیں کیے ہیں بلکہ مسلم قوم کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر وہ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب یعنی قرآن مجید کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں ۔سرسید احمد خان نے مسلم قوم کی بھلائی کے لیے بہت سارے کام کیے۔انیس حسن الدین احمد سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ہندوستانی مسلمان ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ظالمانہ ردِعمل میں پے در پے زخموں سے چور ہو کر گر پڑے تھے۔اس نازک مرحلہ میں قوم کو غیر ملکی حکمرانوں کی آتشِ غضب سے بچاتے ہوئے انتہائی تلخ تجربات کے سلسلے میں سرسید نے محسوس کیا کہ جب تک قوم جہالت کی تاریکیوں سے نجات حاصل نہ کرے گی اس کا آگے بڑھنا ممکن نہیں۔(۲۰)

سرسید احمد خان مسلم قوم کو تاریکی سے نکالنا چاہتے تھے، تاریکی سے نکلنے کا طریقہ بھی انہوں نے بتا دیا تھا کہ قدیم نظامِ تعلیم کو ترک کر کے جدید نظامِ تعلیم کو اپنا کر مسلم قوم ترقی کر سکتی ہے۔اگر مسلم قوم نے جدید نظامِ تعلیم نہ اپنایا تو وہ باقی اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے بلکہ مزید پستی میں گرتی چلی جائے گی۔

سرسید احمد خان کہتے ہیں کہ ہماری قوم کا جو حال ہے وہ غیر قوموں کی نظر میں نہایت حقارت سے دیکھا جاتا ہے وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

> کیمبرج یونیورسٹی لنڈن کے ایک کالج میں بہت سا روپیہ توفیر میں جمع ہو گیا تھا اور اس کے خرچ کرنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہاں کے منتظموں نے تجویز کی کہ اس کالج میں جو گرجا ہے (وہ) بہت عمدہ نہیں ہے۔ اس کو توڑ کر عمدہ گرجا بنایا جاوے اور دس لاکھ روپیہ اس میں خرچ کرنا تجویز ہوا۔اتفاقاً ایک مسلمان بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا کہ اگر یہ روپیہ ہم کو مل جاتا تو ہماری قوم کے لیے ایک عمدہ کالج، جس کی ضرورت ہے، بن جاتا اور گرجے کی تعمیر سے بھی زیادہ مفید وضروری کام میں کام آتا۔ یہ سن کر ایک شخص جو اس کالج سے تعلق رکھتا تھا، جواب دیا کہ اگر تمھاری قوم ایسی ہے کہ وہ اپنی

تعلیم کا انتظام بھی نہیں کر سکتی ہے تو اس کا جینے رہنے سے مر جانا بہتر ہے۔ وہ اس لائق نہیں ہے کہ

اس کی مدد کی جاوے۔۲۱

ادب کا قوم کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ادب قوم اور سماج ہی سے جنم لیتا ہے اور سماج ہی کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔ ادب کا اصل منصب یہ ہے کہ جہاں وہ پڑھے لکھے طبقے میں ذوقِ ادب پیدا کرتا ہے وہیں وہ پسماندہ اور پسے ہوئے استحصال زدہ طبقے کو کھڑا ہوانے اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی تیار کرتا ہے اور ایک بہتر مستقبل کا خواب ہی نہیں بلکہ امید کو بھی جنم دیتا ہے جو ادب کی سب سے بڑی کاوش ہے۔ معاشرے کی تعمیر میں ادب کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اٹھارویں صدی کے بعد کا زمانہ صنعتی اور سائنسی ترقی کے حوالے سے اہمیت کا حاصل تھا۔ برصغیر کا یہ دور نو آبادیاتی دور تھا۔ جس میں ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط مکمل ہو چکا تھا اور انگریز یہاں اپنے برطانوی تسلط کو مظبوط اور مستحکم کرنے کیلئے یہاں کی آبادی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھ رہے تھے جس میں لامحلّہ طور پر وہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بطور حکمران تعلیم، سیاست اور ملکی وسائل میں مسلمانوں کو کسی قسم کی مراعات دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔(۲۲)

مسلمانوں کا نظام تعلیم یکسر ختم ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے علماء اور پڑھے لکھے لوگوں کی اولادوں کے لئے تعلیمی سہولیات اور ملازمتوں کا فقدان تھا۔ سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کیلئے چپڑاسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا، میز کرسیوں اور دفتر کی صفائی کرنے والے سے زیادہ کوئی ملازمت موجود نہیں تھی۔ ان دگرگوں حالات میں سرسید احمد خان نے مسلمان قوم کے حق میں جو کردار ادا کیا اس حوالے سے مباحث کے جتنے بھی دروازے کھولے جائیں وہ اپنی جگہ مگر اس وقت اور ان حالات کے تناظر میں مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کیلئے سرسید نے جو کچھ بھی کیا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟(۲۳)

سرسید احمد خان ۱۸۵۷ء کے بعد ایک ایسی شخصیت کے طور پر ابھرے جنہوں نے مسلمانوں کے حقوق، علم اور تعلیمی حقوق اور ضروریات کے حوالے سے گراں قدر فریضہ سرانجام دیا۔ سرسید احمد خان کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ

بات سامنے آتی ہے کہ مسلم قوم کا ساتھ دینے اور غیر مسلم کے ساتھ تصرف کا اظہار ہوتا ہے۔

سرسید احمد خان نے اس وقت اپنی مساعی شروع کی جو کہ برصغیر میں اہل برصغیر کیلئے سب سے نازک دور تھا۔ برطانیہ سامراج اپنے اقتدار، طاقت اور حکمرانی کے نشے میں اہل ہند کا استحصال کر رہے تھے اور بڑے خطرناک بات یہ تھی کہ وہ اہل ہند کو مختلف حوالوں سے کئی چھوٹے چھوٹے گروہوں اور اقلیتوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہتے تھے۔ برصغیر میں مسلمان قوم ابتری اور تفریق کا شکار تھی۔ ایسے میں سرسید احمد خان نے اپنی علمی اور فکری اصلاح کا رخ مسلمان قوم کی طرف موڑا۔ سرسید احمد خان اپنی ادبی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کو ایک قوم بنانا چاہتے تھے۔ بقول مولوی عبدالحق:

> سرسید نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سید، شیخ، مغل اور پٹھان تھی۔ سرسید احمد خان نے ''نیشن'' کا ہم معنی بنا دیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا (۲۴)

سرسید احمد خان غلامی کے دور میں سانس لے رہے تھے اور اس غلامانہ نظام کا حصہ بھی تھے، مگر ان کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اسی نظام میں رہتے ہوئے اسے تسلیم کرتے ہوئے اس کی برائیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنی قوم میں اچھائیاں تلاش اور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا الطاف حسین حالی حیات جاوید میں پر کیے جانے والے اعتراضات کے جواب میں کہتے ہیں کہ وہ سب باتیں اپنی جگہ مگر یہ ضرور دیکھیں کہ میں قوم کی بھلائی کیلئے کیا کر رہا ہوں۔ کہتے ہیں۔

اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم، اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔ (۲۵)

سیر سید احمد خان یکم اپریل ۱۸۶۹ء انگلستان تشریف لے گئے تا کہ وہاں انگریزوں کی تہذیب و ثقافت، معاشرت اور تعلیم و سیاست کا مشاہدہ کر سکیں۔ واپس آ کر انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو علمی و ادبی مجلّہ تہذیب الاخلاق جاری کر کے ادب کے ذریعے قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تہذیبی و معاشرتی خامیوں کو ختم کرنے کی کوشش

کی "تہذیب الاخلاق" کا اجراء سرسید احمد خان کا ایک اہم کارنامہ تھا یہ جن مضامین پر مشتمل ہوتا تھا ان میں موضوع اور اور اسلوب کی تنوع کے ساتھ ساتھ نفس مضمون کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ شگفتگی اور شوخی کی جگہ مقصد کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے مضامین کا بنیادی مقصد قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تہذیبی و معاشرتی خامیوں کو ختم کرنا تھا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی میں سرسید احمد خان وہ پہلے ادیب تھے جنہوں نے ادب کو لوگوں میں شعور پیدا کرنے اصلاح احوال کرنے، یکجا ہونے کیلئے موثر آلے کے طور پر استعمال کیا۔(۲۶) سرسید تحریک کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

> اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں انقلاب بپا کیا اور ایک جداگانہ قوم کا احساس پیدا کر کے سیاسی کامیابیوں کی راہ ہموار کی۔(۲۷)

سرسید احمد خان نے مسلمانوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شعور بیدار کیا وہ جانتے تھے کہ تعلیم کے بغیر مسلمان ترقی نہیں کر سکتے ہیں اور نہ ہی انگریز اور ہندو سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں وہ سمجھتے تھے کہ تعلیم کے بل بوتے پر ہی برِعظیم پاک و ہند کے مسلمان انگریزوں سے ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ قوموں کی تعمیر میں ادب پانی کے اس قطرے کی طرح ہے جو کسی پتھر کی سل پر گرتا رہے تو اس میں سوراخ پیدا کر دے۔ یہی کام تہذیب الاخلاق کی تحریروں نے کیا۔ آپ نے تہذیب الاخلاق رسالہ میں اصلاحی اور ملّی نوعیت کے مضامین تحریر کر کے مسلمانوں کو فلاح کا راستہ دکھایا۔

تہذیب الاخلاق کے بارے میں سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

> اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے، تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں، وہ رَفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلا دیں۔ سویلزیشن انگریزی کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے تہذیب کیا ہے۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس مراد ہے انسان کے عام

اَفعال آزادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون وہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی وہنر اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی حاصل ہوتی ہے اور ممکن وَقار وقدر ومنزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز آتی ہے۔ یہ بات نہایت سچ ہے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے میں اس قوم کے مذہب کو بھی بڑا دخل ہے۔ بے شک بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قومی کے بڑے مانع ہوتے ہیں۔۔۔۔ یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہو سکے اُن کے دین ودنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقص ہم میں ہیں، گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں۔ ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں اُن میں ہیں اُن میں ترقی کرنے کی اُن کو رغبت دلائیں: واللہ ولی التوفیق (۲۸)

سرسید احمد خان کو اُمید تھی کہ اس رسالے کے اجرا کے بعد مسلمان اس رسالے کو پڑھیں گے یقیناً اُن کے اذہان تبدیلی کی طرف مائل ہوں گے۔ سرسید احمد خان نے ایک اہم مقصد مسلمانوں کو سیاسی، معاشرتی تنزلی سے نکالنا تھا۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کی خاطر وہ تمام تر مخالفت کے باوجود ۸رجنوری ۱۸۷۷ء کو ایم اے او کالج (محمڈن اورینٹل کالج) کا سنگ بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گئے جو بعد میں ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ اختیار کر گیا۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی بیداری اور ترقی کیلئے ۲۷ردسمبر ۱۸۸۶ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد رکھ کر ایک اور نمایاں کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے جلسوں میں قوم کو جگانے کیلئے نہ صرف تقاریر اور لیکچرار کا اہتمام کیا جاتا بلکہ نظمیں بھی پڑھی جاتیں۔ سرسید احمد خان قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے اور انہیں عقل وشعور کی تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔ سرسید کہتے ہیں:

خدا نے جو ہم کو عقل دی ہے اور جس کا یہ فائدہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم اس کو کام میں لائیں، اور اوروں پر بھروسہ کر کے اس کو بیکار کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے میں ہم صرف اپنا ہی نقصان نہیں

کرتے بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی بہت بڑا نقصان پہنچاتے ہیں۔(۲۹)

سرسید احمد خان بہت متوازن دل و دماغ کے انسان تھے۔شدید بحرانی دور میں انہوں نے مسلمانوں کی حالت پر گہرا سوچ و بچار کیا اور قوم کو ایک نیا فلسفہ زندگی بخشا۔انہوں نے بتایا کہ ہر قوم کی تقدیر اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔اگر حالات بدل جائیں تو طرزِ فکر اور طرزِ عمل بدلنا ضروری ہوتا ہے۔انہوں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف بھر پور توجہ دینے اور سیاست سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔انہوں نے یہ تعلیم بھی دی کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب پر استوار ہے۔اگر مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑا تو ان کے وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔

ایم اے او کالج کا قیام تصنیف وتالیف اور یونیورسٹی کے قیام کا خواب لیے سرسید احمد خان برسرِ عمل رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اُن کی عظمتِ رفتہ کا آئینہ دکھا کر دعوتِ عمل دی۔سرسید سمجھتے تھے کہ تعلیم کے بغیر مسلمان پس ماندہ رہیں گے۔انگریزوں کا مقابلہ کرنے لیئے تعلیم سب سے بڑا ہتھیار ہے۔مسلمانوں نے آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے تحریک آزادی میں پڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ (۳۰)

برِعظیم پاک وہند میں سرسید آحمد خان نے قومیت کا مفہوم ہی بدل ڈالا اور انگلستان میں اصلاحی تحریک کا دیکھا ہوا خواب علی گڑھ نے پورا کر دکھایا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں جو اتار چڑھاؤ آیا اُس نے کچھ ہی عرصے میں سب کچھ تہ وبالا کر کے رکھ دیا مقامی سطح پر انگریز کے خلاف مزاحمت سے عوام کا کافی جانی ومالی نقصان ہوا۔اس نقصان کی وجہ سے مسلمان متاثرین آزادی اور اُن کے ورثا کو تحفظات تھے اس صورت حال میں ایک بکھری ہوئی قوم کو یکجا کر کے کسی طور پر مستقبل کے تعین کے لیئے کسی مناسب راہ پر چلانا بلاشبہ سرسید آحمد خان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی فضا مسلمانوں کے لیئے سازگار نہیں رہی تھی۔اس بگڑی ہوئی حالت کو سازگار بنانے کے لیئے جس ہمت اور استقامت کے ساتھ ایک قوم کو صحیح راستہ دکھانا اور اُن کے لیئے سیاسی جدوجہد کا آغاز کرنا سرسید کے حصّے میں آتا ہے۔(۳۱)

۱۸۵۷ء سے پہلے لکھی گئی تحرویریں کے موضوعات اور اسلوب اُس کے بعد کی تحریروں سے یکسر مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ سرسید کا وہ نقطہ نظر ہے جس کو سرسید نے معاشرے کی اصلاح، مسلمانوں کی اصلاح، سیاسی نظریے کی اصلاح اور دور اندیشی پر مبنی استدلال قائم کرتی ہوئی تحریریں ہمیں ایک نئے سرسید کا پتا دیتی ہیں۔ پہلے کی تحریروں میں معاشرے میں سیاسی اور مذہبی حوالے کی اس طرح پیش نہیں کیا گیا جیسا کہ بعد کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ پہلے وہ ''آثارالصنادید'' لکھتے اور قدیمی عبارتوں کے کتبے پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر ۱۸۵۷ء کے میں اُن کی شخصیت میں یکسر قومیت جاگ اُٹھتی ہے اور پھر اُن کا اندازِ تخاطب دردمندی میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ بقول سرسید احمد خان:

> اب ہم کو ہندوستان کے مسلمانوں پر غور کرنا چاہیے، جو بطورِ رعیت کے اور مطمئن ہو کر انگلش گورنمنٹ کے ماتحت رہتے ہیں۔ انگلش گورنمنٹ نے اُن کے ساتھ عدل وانصاف کرنے میں بقدر اپنی طاقت کے کوئی دقیقہ نہیں رکھا۔ اُن کے تمام معاملات کے فیصلہ کے لیئے قانون بنادیئے ہیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ کسی فعل کا نتیجہ وہ ہے جو قانون میں لکھا ہے۔ مذہبی آزادی انگلش گورنمنٹ نے ہر قوم کو دی ہے۔ تمام مذاہب والوں کے مذہبی معاملات اُن کے مذہبی مسائل کے موافق عدالت سے فیصلے ہوتے ہیں۔ جان اور مال کا امن سوائے بغاوت اور شرارت کے ہر قسم کی آزادی انگلش گورنمنٹ کی رعیت کو حاصل ہے۔۔۔۔ انگلش گورنمنٹ کی رعایا ہو کر وہ انگلش گورنمنٹ کے ساتھ کسی قسم کا فساد یا مخالفت یا بغاوت قولاً یا فعلاً نہیں کر سکتے۔ (۳۲)

قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان کے اجتماعی مرض کی کی تشخیص کرنا عمرانی ماہرین کی سائنس ہے۔ قیافہ شناس سرسید قوم کی نگاہوں کو بڑھ کر ان کے دلوں میں اترنے کا فن جانتے تھے۔ وہ بڑی بڑی باتوں کو مختصر لفظوں میں سمیٹ کر پانے مخالفین تک کے قبلے درست کر دیا کرتے تھے۔ یہی نہیں حاکم وقت بھی قلم زد ہوتا تو نتائج قوم کے حق میں اچھے نکلتے۔ سرسید احمد خان نے کہا:

> ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی، مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بستی ہیں'' (۳۳)

سرسید احمد خان نے غدار، کافر، نیچری جیسے فتوؤں کے باوجود مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے منور کیا۔ ایک دفعہ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

> سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ ہے۔ اس پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم ،قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے، پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا! (۳۴)

مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزت نصیب ہو گی۔ سر سید احمد خان کی خدمات کو سمجھنے کے لیئے ایک زمانہ درکار ہے۔ اُن کی علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی خدمات کے لیے الگ ایک زمانہ درکار ہے۔ اُن کی علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی خدمات کے لیے الگ لگ کتب درکار ہیں۔ جنگِ آزادی کے دوران اور تحریکِ علی گڑھ سے وصال تک اُن کی خدمات کو سلسلہ جاری رہا۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ سرسید اوّل تا آخر محبِ قوم تھے۔ قوم سے اُن کا لگاؤ والہانہ تھا۔ انہوں نے جو بھی کام کیا اس میں جذبہ قومیت موجود تھا۔ سرسید آحمد خان مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے کیونکہ وہ مسلم قوم کے محسن اور دوقومی نظریہ کے محرک تھے۔

حوالہ جات

۱۔ ابواعلیٰ مودودی، سید، مسئلہ قومیت، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ ۱۹۹۳ء ص ۱۳

۲۔ کامل قریشی، ڈاکٹر، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مرتبہ، اردو کادمی، دہلی، ۲۰۰۶ء ص ۱۳۹

۳۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۴۔ القرآن

۵۔ القرآن

۶۔ القرآن

۷۔ الحدیث

۸۔ عطاءاللہ شیخ، اقبال نامہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور طبع نو ۲۰۰۵ء

۹۔ محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ، خطباتِ سرسید، مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور طباعت دوم جون ۲۰۰۹ء ص ۱۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۷۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۸۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۸۹

۱۷۔ ایضاً،ص۴۰۴

۱۸۔ ایضاً،۴۲۴

۱۸۔ ایضاً،۴۴۲

۱۹۔ ایضاً،۴۵۰

۲۰۔ ایضاً،۵۲۶

۲۱۔ ایضاً،ص۵۵۰

۲۲۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، نیا ادارہ لاہور۱۹۶۹ء ص۴۴

۲۳۔ ایضاً، ص۹۲

۲۴۔ عبدالحق مولوی،سر سید احمد خان حالات و افکار،اردو مرکز ،اردو بازار دھلی ۱۹۶۰ء ص۲۲

۲۵۔ حالی،الطاف حسین،حیاتِ جاوید،لاہور۱۹۸۶ء ص۳۶

۲۶۔ محمد اکرام چغتائی،مضامینِ سرسید مرتبہ،سنگِ میل پبلی کیشنز۲۰۰۸ء ص۶۷

۲۷۔ انور سدید ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں،انجمن ترقیِ اردو کراچی۱۹۸۳ء ص۸۹

۲۸۔ سرسید احمد خان،مقالاتِ سرسید جلد دہم،مجلس ترقیِ ادب لاہور۱۹۹۲ء ص۱۲۵

۲۹۔ سرسید احمد خان،ہماری تعلیم ہماری زبان میں،مشمولہ مقالاتِ سرسید حصہ ہشتم مجلس ترقیِ ادب لاہور۱۹۹۱ء ص۵۶

۳۰۔ محمد اکرام چغتائی،مضامینِ سرسید مرتبہ،سنگِ میل پبلی کیشنز۲۰۰۸ء صہ۱۶۰

۳۱۔ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید جلد دہم،مجلس ترقیِ ادب لاہور۱۹۹۲ء ص۲۰۹

۳۲۔ ایضاً ص۱۶۵

۳۳۔ محمد اکرام چغتائی، مضامینِ سرسید مرتبہ، سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء ۱۵۷

۳۴۔ جالبی جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۲۰۰۸ء ص ۱۴۷

باب دوم

مسلم قومیت کا تصور اور اردو ادب

ا۔ مسلم قومیت کا تصور:

مسلم قوم کی بنیاد وہ برادری ہے جس میں کسی ملک اور خطے کی تمیز نہیں ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مظبوط تھامے رہو اور آپس میں متفرق نہ ہو جائے۔ اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت (اسلام) کی بدولت بھائی بھائی بن گئے۔ تم آپس کی عصبیت کی بدولت آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم اس سے بچالیا۔ (آل عمران) (۱)

اس آیت میں مسلم قومیت کا تصور ہے اس کے برعکس تمام غیر مسلموں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں، نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں''۔ التوبہ (۲)

اسلام اور کفر کے اختلاف سے خون کے قریب ترین رشتے کٹ جاتے ہیں۔ ماں، باپ، بھائی، بیٹے صرف اس لئے جدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اسلام کے مخالف ہیں۔ ہم نسل قوم کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خدا سے دشمنی رکھتے ہیں۔ وطن کو اس لئے خیر آباد کہا جاتا ہے کہ وہاں اسلام اور کفر میں عداوت ہے۔

'قومیت اسلامیہ کے افرادِ مساوات کو قائم برقرار رکھنے کیلئے رسول اللہؐ ارشاد فرماتے ہیں۔

تم سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ کی پیدائش خاک سے ہے (۳)

(i). مسلم قومیت کے بنیادی تصورات

دنیا میں بہت ساری اقوام آباد ہیں اور ہر قوم کی ایک خاص شناخت ہوتی ہے اگر ہمیں کوئی یہ کہے کہ یہ عیسائی قوم سے تعلق رکھتا ہے تو ہمارے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کا پیروکار ہے اور عیسائی قوم گرجا گھر میں عبادت کرتی ہے اور بہت سارے اُن کے کام جو وہ مذہب کے حوالے سے کرتے ہیں وہ ہمارے ذہن میں آجائیں گے۔ اسی طرح جب کوئی مسلم قوم کا نام لیتا ہے تو ہمارے ذہن میں بہت ساری باتیں آتی ہیں پہلی بات جو ہمارے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ اللہ اور اُس کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ مسلم قوم کا پہلا بنیادی تصور ہے اگر کوئی اس سے انکار کرے تو وہ مسلم قوم میں نہیں رہے گا۔

ایمان اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ توحید ورسالت کے اقرار کا نام ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا اقرار کرتا ہے تو وہ مسلم قوم کا جو پہلا بنیادی تصور ہے اس کا اقرار کر لیتا ہے اب وہ مسلم قوم میں شامل ہے۔ ایمان یہ کہ آدمی اللہ پر، اُس کے رسولوں پر، اُس کے ملائکہ پر، اُس کی کتب پر، آخرت پر اور قیامت کے روز باز پرس پر ایمان لانا ضروری ہے اگر وہ ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کرتا ہے تو وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف کر سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا'' شرک کو اللہ تعالیٰ نے ظلمِ عظیم بھی کہا ہے۔

رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے انسان کو اس دنیا میں بھیجا ہے تو اس کی ہدایت کے لیے اپنے مقرب بندے بھی بھیجے ہیں جن کو رسل کہتے ہیں ان سب پر ایمان لانا مسلم قوم کا بنیادی تصور ہے اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لیے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے جنہوں نے آکر بندگانِ خدا کو ہدایت کی طرف بلایا ۔ یہ ایسا مسلم قومیت کا بنیادی تصور ہے کہ اس بغیر آدمی مسلم قومیت میں داخل ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیا اکرامؑ اور رسل انسانی ہدایت کے لیے بھیجے تھے ان سب پر ایمان لانا ہر مسلمان پر فرض ہے اگر وہ کسی ایک کا بھی انکار کرے تو وہ مسلم قوم میں نہیں رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے جتنے بھی پیغمبر حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک بھیجے ہیں ان سب پر ایمان لانا مسلم قومیت کا دوسرا بنیادی تصور ہے۔

مسلم قوم کا تیسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ جو باتیں اللہ اور اُس کے رسول حضرت محمد ﷺ نے بتائیں ہیں اُن پر ایمان لانا اور عمل کرنا مسلم قوم پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے

اے محمد ﷺ ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے جس نے رسول کی اطاعت کی دراصل اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تم کو ان پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلم قومیت کو جو تیسرا بنیادی تصور ہے اس کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر تم میرے اطاعت گزار بندہ بننا چاہتے ہو تو میرے حبیب ﷺ کی پیروی کرو۔ اس چیز کو نبی اکرم ﷺ نے بھی بیان کیا ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے جب تک میں اس کو اُس کے والدین اس کی اولاد یہاں تک کہ پوری انسانیت میں سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

محمد ﷺ کی غلامی دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے

ہوا گر اس میں ذرا سی خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

مسلم قوم کا جوتھا بنیادی تصور نماز ہے ۔قرآن مجید میں کم وبیش سات سو مرتبہ نماز کا ذکر آیا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں بھی اس کی بڑی فضیلت بتائی گئی ہے اور نہ پڑھنے پر بڑی وعیدیں سنائی گئی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ قران مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔

وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں ، جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے ،اس میں سے خرچ کرتے ہیں

اس آیت میں مسلم قومیت کا جو بنیادی تصور بیان کیا گیا ہے وہ نماز ہے ۔نماز مسلم قومیت کا ایسا بنیادی تصور ہے کہ اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی (یعنی قضا) کی گویا اس نے کفر کیا'' نماز مسلم قومیت کا ایسا بنیادی تصور ہے کہ یہ عملی اطاعت کی اوّلین علامت اور دائمی علامت ہے ۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ آدمی کو ایمان لائے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ مؤذن نماز کے لیے پکارتا ہے اس وقت ہی پتا چل جاتا ہے کہ ایمان کا دعوٰی کرنے والا اطاعت کے لیے تیار ہے کہ نہیں ۔

نماز مسلم قومیت کا ایسا بنیادی تصور ہے کہ اس کے بہت سارے فائدے ہیں ۔ نماز برائیوں سے روکتی ہے ،نماز سے مسلم معاشرے میں امن وسکون ہوتا ہے ،نماز مومن کی معراج ہے ۔قرآن مجید میں نماز کے بارے میں اقامتِ صلوٰۃ کہا گیا ہے یعنی کہ نماز قائم کرو ۔ اقامتِ صلوٰۃ ایک جامع اصطلاح ہے ۔ اس کے معنی صرف یہ نہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نماز کا نظام باقاعدہ قائم کیا جائے ۔اگر کسی بستی میں ایک شخص انفرادی طور پر نماز کا پابند ہو ،لیکن جماعت کے ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کا نظم نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں نماز قائم کی جارہی ہے ۔

نماز کے بارے میں ایک اور جگہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے کام لو ۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلم قومیت کو بہت بڑا سبق دے رہیں کہ اگر دنیاوی زندگی میں تمہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے تو تم نے پریشان نہیں ہونا ہے بلکہ تم نے صبر اور نماز سے کام لینا ہے اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ نماز مسلم قوم کے اندر صبر کی صفت پیدا کرتی ہے ۔ نماز ایک بدنی عبادت ہے ۔روزِ حشر سب سے پہلے اسی کے بارے میں پوچھا جائے گا ۔نماز ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے ۔

مسلم قوم کا پانچواں بنیادی تصور روزہ ہے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر سال کے ایک مہینے کے روزے فرض کیے ہیں ۔ روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ،تم پر روزے فرض کر دیے گئے ،جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیروں پر فرض کیے

گئے تھے۔اس سے توقع ہے کہ تم میں تقوٰی کی صفت پیدا ہوگی۔

روزہ مسلم قومیت کا ایسا بنیادی تصور ہے جس کے بہت سے روحانی اور جسمانی فوائد ہیں اس سے ایک تو یہ پتا چلتا ہے کہ بھوک اور پیاس کیا چیز ہے،مسلمان کے اندر ایسی کیفیت کا پیدا کرنا کہ وہ دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کر سکے یہ صرف روزے سے ہی ہوسکتا ہے۔

مسلم قوم کا چھٹا بنیادی تصور زکوٰۃ ہے زکوٰۃ امیروں سے لی جاتی ہے اور غربا میں تقسیم کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ جیسا نظام اسلام کے سوا کسی مذہب میں نہیں ہے۔نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں۔ زکوٰۃ کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں

زکوٰۃ دینے اور زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہونے پر بڑا فرق ہے۔ زکوٰۃ دینا تو ایک سیدھا سا عمل ہے کہ آدمی اپنی مالیت کا حساب لگائے اور اس میں سے جو زکوٰۃ بنتی ہے وہ نکال دے اور زکوٰۃ پر عامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تزکیہ کی خاطر مال کا ایک حصہ دیتے یا ادا کرتے ہیں اس سے مراد یہ کہ وہ مالی ، اخلاقی اور ہر قسم کا تزکیہ کرتے ہیں۔اس سے ایک اور بھی مراد بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی پاک کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی پاک کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں۔زکوٰۃ مسلم قومیت کا وہ بنیادی تصور ہے جو مسلم قوم میں مالی ایثار ، آپس کی ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ آج کا کے لوگ غلطی سے زکوٰۃ کو ''ٹیکس'' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں ، حالانکہ زکوٰۃ کی روح ٹیکس کی اسپرٹس سے بالکل مختلف ہے۔ زکوٰۃ کے اصل معنی نشوونما اور پاکیزگی کے ہیں ۔ زکوٰۃ کے لفظ سے اسلام یہ حقیقت آدمی کے ذہن نشین کرتا ہے کہ خدا کی محبت میں اپنے بھائیوں کی جو مالی امداد تم کروگے اس سے تمہاری روح کو بالیدگی اور تمہارے اخلاق کو پاکیزگی نصیب ہوگی۔

مسلم قوم کا ساتواں بنیادی تصور حج ہے۔ حج زندگی میں ایک بار صاحبِ نصاب آدمی پر فرض ہے۔حج ایسا مسلم قومیت کا بنیادی تصور ہے جو خداترسی کے محور پر اہلِ ایمان کی ایک عالم گیر برادری بناتا ہے اور ایک ایسی بین الاقوامی تحریک چلاتا ہے جو دنیا میں صدیوں سے دعوتِ حق پر لبیک کہہ رہی ہے۔حج مالی عبادت بھی ہے اور بدنی بھی۔ یہ بھی زکوٰۃ کی طرح

صرف صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔

مسلم قوم کا آٹھواں بنیادی تصور جہاد ہے۔ اگر کفار مسلمانوں کو تنگ کریں تو مسلم قوم پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ جہاد مسلم قومیت کا وہ بنیادی تصور ہے جو پوری دنیا میں غیر اسلامی نظام کی حکومت مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام کا جہاد لوگوں کے عقیدہ و مسلک اور اُن کے طریقے عبادت یا قوانینِ معاشرت سے تعرض نہیں کرتا وہ اُن کو پوری آزادی دیتا ہے کہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں اور جس مسلک پر چاہیں چلیں۔ البتہ وہ ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ ان کی خاطر کسی ایسے طریقے پر حکومت کا نظام چلایا جائے جو اسلام کی نگاہ میں فاسد ہے۔

یہ مسلم قومیت کے بنیادی تصورات ہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری خوبیاں ہیں جن سے مسلم قومیت کی شناخت ہوسکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اس حدیث میں مسلم قومیت کی ایک بنیادی صفت بیان کی گئی ہے کہ مسلمان وہ جو نہ کسی کو اپنی زبان سے تنگ کرتا ہے اور نہ اپنے ہاتھ سے کسی کو تنگ کرتا ہے۔

مسلم قوم کی بنیاد وہ برادری ہے جس میں کسی ملک اور خطے کی تمیز نہیں ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مظبوط تھامے رہو اور آپس میں متفرق نہ ہو جائے۔ اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت (اسلام) کی بدولت بھائی بھائی بن گئے۔ تم آپس کی عصبیت کی بدولت آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم اس سے بچالیا۔ (آل عمران)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلم قوم سے کہتے ہیں کہ تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اللہ کی رسی سے مراد اللہ کا دین ہے یعنی کہ تم دین پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ اور آپس میں دینی معاملات میں نہ لڑو کیونکہ اس سے تمہارا نقصان ہوگا اس کے بعد اللہ تعالیٰ مسلم قوم کو یہ بات یاد کراتے ہیں کہ جب تم مسلمان نہیں تھے تو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے یہ اسلام کی نعمت ہی ہے کہ تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے ہو اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں ہدایت نہ دی جاتی تو تم نقصان اٹھاتے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت میں مسلم قومیت کا بنیادی تصور بڑے واضع طریقے سے بتایا گیا ہے۔

بے شک تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں

اس آیت میں مسلم قومیت کا بنیادی تصور ہے کہ دنیا میں کسی کونے میں رہنے والا مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اگر چہ اُن دونوں کے درمیان بیسوں ممالک کا فاصلہ ہو اس کے باوجود اسلام نے انہیں ایک دوسرے کا بھائی بھائی قرار دیا ہے۔

اس کے برعکس تمام غیر مسلموں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ ''اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں''

اس مختصر سی آیت میں مسلم قومیت کی ایک خوبی بیان کی گئی ہے کہ جو شخص پہلے کافر تھا اب مسلمان ہو گیا ہے اس نے کفر سے توبہ کر لی ہے اب وہ نماز بھی پڑھ رہا ہے اور زکوٰۃ بھی دے رہا ہے تو اب وہ تمہارا دینی بھائی ہے وہ مسلم قوم کے اندر داخل ہو گیا ہے۔

اسلام اور کفر کے اختلاف سے خون کے قریب ترین رشتے کٹ جاتے ہیں۔ ماں، باپ، بھائی، بیٹے صرف اس لئے جدا ہو جاتے ہیں کہ وہ
اسلام کے مخالف ہیں۔ ہم نسل قوم کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خدا سے دشمنی رکھتے ہیں۔ وطن کو اس لئے خیر آباد کہا جاتا ہے کہ وہاں اسلام اور کفر میں عداوت ہے۔
اسلام نے اُن تمام قومی اور نسلی امتیاز پر ضرب لگائی ہے جو دنیا میں فساد کا موجب بنتے ہیں۔ قوموں اور قبیلوں کا اپنے شرف پر فخر و غرور اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنا اور اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے دوسروں کو گرانا اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا ہے۔
قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ

تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا (الحجرات)

اس آیت میں دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک عالم گیر برادری قرار دیا گیا ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ کسی دوسرے دین تا مذہب کے پیروں کاروں میں وہ اخوت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔
مسلم قومیت کو سمجھانے کے لیے احادیثِ مبارکہ میں رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے بکثرت ارشادات بیان فرمائے ہیں جن سے مسلم قومیت کی پوری روح سمجھ میں آسکتی ہے۔
''حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین باتوں پر مجھ سے بیعت لی تھی۔ ایک یہ کہ نماز قائم کروں

گا۔ دوسری یہ کہ زکوٰۃ دوں گا اور تیسری یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔
ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ ''مومن ایک دوسرے کے لیے ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ہوتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے سے تقویت پاتا ہے''

ان دونوں ارشادات سے مسلم قومیت کا بنیادی تصور واضح طور پر سمجھ آ جاتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو بہت سی برائیوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ سب سے پہلے مسلم قوم کو جس برائی سے منع کیا گیا ہے وہ تمسخر ہے دوسرے نمبر پر بدگمانی ہے تیسرے نمبر پر جو برائی بیان کی گئی ہے وہ غیبت ہے ۔ ان برائیوں کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلم قوم ایک پاکیزہ قوم بنے۔

اللہ اور اس کے رسولؐ نے جاہلیت کی ان تمام محدود مادی حسی اور وہمی بنیادوں کو جن پر دنیا کی مختلف قومیتیوں معیشت اور سیاست کے بغیر عقلی تفریقوں کو جن کی بنا پر انسان نے اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے انسانیت کو تقسیم کر رکھا تھا۔ مٹا دیا اور انسانیت کے مادے میں تمام انسانوں کو برابر اور ایک دوسرے کا ہم مرتبہ قرار دے دیا۔ اس تخریب کے ساتھ اس نے خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعمیر کی۔ اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی، مگر مادی اور غرضی امتیاز پر نہیں بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام "اسلام" ہے اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی پاکیزگی و طہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوعِ بشری کو دعوت دی، پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کرے وہ دوسری قوم سے ہے۔ ایک قوم ایمان اور اسلام کی ہے اور اس کے سب افراد ایک امت ہیں اور ایک قوم کفر اور گمراہی کی ہے، اور اس کے متبعین اپنے اختلاف کے باوجود ایک گروہ ہیں۔

ان دونوں کے درمیان بنائے امتیاز نسل اور نسب نہیں، اعتقاد اور عمل ہے ہوسکتا ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے اسلام اور اسلام میں متحد ہونے کی وجہ سے ایک قومیت میں مشترک ہوں۔ اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے۔ ایک گھر کے دو آدمی اس دائرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور مشرق و مغرب کا بعد رکھنے والے دو آدمی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

(ii). قومیت کا تصور اور سرسید

عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ قوم ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جس کا تعلق ایک ہی نسل سے ہو اور جو لسانی و تہذیبی اعتبار سے وحدت کا علم بردار ہو، مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اس خیال میں کسی حد تک صداقت موجود نہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی اکثر ممالک میں سے ہر ایک ملک میں مختلف زبانیں بولنے والے اور جداگانہ تہذیبی و ثقافتی پس منظر کے حامل لوگ آباد ہوتے ہیں، اس بات کو مذہبی اعتبار سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ضروری نہیں کہ ایک ملک میں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہوں، اور ہوتا بھی یہی ہے کہ ایک ملک میں مختلف المذاہب لوگ آباد ہوتے ہیں

افکار سرسید کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انھوں نے بعض اوقات قوم کو ذات، نسل، علاقے، طبقات اور مذاہب کی بنیاد پر الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے قوم کا نام دیا، اور بعض اوقات تمام ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم سے موسوم کیا، قوم کیا ہے اور قوم کی متعین اور جامع تعریف کیا ہے، یہ وہ سوال ہے جس کا جواب دیئے بغیر بات آگے نہیں بڑھائی جاسکتی، اس سلسلے میں اردو وکی پیڈیا میں قومیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

> قومیت سے مراد کسی خطے میں افراد کا وہ گروہ ہے جس کا تعلق ایک نسل سے ہو، جس کی تاریخی اور تہذیبی روایات مشترک ہوں جن کے درمیان لسانی وحدت ہو اور جو انتظامی طور پر متحد ہوں (۴)

(iii). اقوام عالم کا منظر نامہ اور قوم پرستی

قوم پرستی کے شعور کا جائزہ لینے کے لیے اس بات کا ذکر کرنا انتہائی ضروری ہے کہ دنیا میں قوم پرستی کے نظریے نے کیسے فروغ پایا، اگر یورپ اور امریکہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان ممالک نے قوم پرست کے نظریے کے ارتقا میں بنیادی نوعیت کا اہم کام سرانجام دیا ہے، قوم پرستی کے نظریے کے تحفظ اور فروغ میں انقلاب فرانس کی مثال بھی دی جاسکتی ہے، امریکی کی جنگ آزادی اور شہنشاہیت کا خاتمہ بھی بطور مثال کیا جاسکتا ہے

یوں دیکھا جائے تو اقوام عالم نے قوم پرستی کے فروغ، ارتقا اور تحفظ کے لیے بیش بہا کارنامے سر

انجام دیئے ہیں،اس سلسلے میں دو رویے جن کا ذکر کیے بغیر قوم پرستی کا مفہوم واضح نہیں ہوسکتا، ان رویوں میں ایک رویہ مثبت اور دوسرا منفی نوعیت کا حامل ہے پہلی جنگ عظیم میں بڑی اقوام نے چھوٹی قوموں کے خاتمے کے لیے سرتوڑ کوشش کیا،دوسری اقوام کے دولت پر قبضہ اور جارحیت کر کے ان کے علاقوں کو زیر انتظام لانا اس کی ایک مثال ہے

(iv). برصغیر کے مسلمان اور تصور قومیت

یوں تو برصغیر میں عربوں کی آمد صدیوں سے جاری رہی لیکن محمد بن کی قاسم کی آمد کے بعد مسلمان باقاعدہ اس علاقے میں مقیم ہونا شروع ہوئے،اس کے بعد مغلوں کی آمد نے اس اقدام کو مزید قوت بخشی اور مسلمانوں کی حکومت کو استحکام ملنا شروع ہوا،۱۸۵۷ء تک آتے آتے مسلمانوں کی حکومت عدم استحکام کا شکار ہوگئی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہی وہ اہم موڑ ثابت ہوا جس کے بعد مسلمانوں کا برصغیر پر طویل اقتدار تقریباً خاتمے کی طرف بڑھ گیا

یوں تو انگریزوں کا خلاف بغاوت کا علم برصغیر میں موجود تمام ہی اقوام نے بلند کیا لیکن اس کا خمیازہ دراصل مسلمانوں کو بھگتنا پڑا،وہ یوں کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے طویل اقتدار کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف ان کے مذہبی ،تہذیبی و ثقافتی تشخص کو شدید نقصان پہنچا،ہندوؤں کی ابن الوقت نے جلتی پہ تیل کا کام دکھایا اور ہندوؤں نے بظاہر مسلمانوں کو ساتھ ملا کر انگریز کے خلاف تحریک چلانے کی ٹھانی لیکن در حقیقت وہ مسلم دشمنی کی تاریخی سازش میں کامیاب رہے اور انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنے قومی وملی تشخص کی بحالی وتحفظ کے لیے کوشاں رہے جس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی رہے

بدلتے ہوئے حالات کا رخ بھانپ کر ہندو جدید تعلیم اور اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے،مسلمانوں کے لیے انگریزی زبان سیکھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کی اپنی زبان فارسی ثابت ہوئی ،اور دوسری سطح پر ان کے اپنے بنائے ہوئے تعلیمی ادارے بھی تباہ حالی کا منظر پیش کرنے لگے،ایسے میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے اور جدید علوم سے بہرہور ہونے کی طرف راغب کرنے کی ٹھانی تا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کر کے اور انگریزی زبان سیکھ کر شریک اقتدار ہوسکیں،سرسید کا کردار یہیں تک محدود نہ تھا بلکہ انھوں نے انگریزوں کے دل میں ہندوؤں کی طرف سے پیدا کی گئی مسلمانوں کی نفرت کو بھی ختم کرنے کی مفید مساعی

کیں،انھوں نے انگریزوں کو یہ باور کرانے کی ممکن حد تک کوشش کی کہ مسلمان ان کے دشمن نہیں،اس سلسلے میں انھوں نے اسباب بغاوت ہنداور لائل محمڈنز آف انڈیا تحریر کیں۔

ان کتب کے دو فائدے ہوئے ایک تو انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے بارے میں شکوک و شبہات میں کمی واقع ہوئی اور دوسرا مسلمانوں اور ہندوؤں کے الگ الگ قوم اور جداگانہ تشخص کی شکل واضح ہوئی جو آگے چل تحریک پاکستان میں مدد و معاون ثابت ہوئی،ہندوؤں کے تمام حربے وقتی طور پر تو کامیاب ہوئے لیکن بالآخر مسلمان اپنے عظیم قائدین کی قیادت میں الگ ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

ہندوؤں کی مسلم دشمنی میں ہندوؤں کی مسلمانوں کی زبان یعنی اردو سے نفرت کا ذکر معروف مستشرق گارساں دتاسی ۱۸۷۱ء نے یوں بیان کیا

> اردو ہندی کے متعلق لسانی مباحث کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ہندوستان کے ایک اخبار میں پڑھنے میں آیا ہے کہ صوبہ ہائے شمالی ومغربی کے دو لاکھ شدت پسند ہندوؤں کے دستخط سے کلکتہ کی مرکزی حکومت کے روبرو ایک مفروضہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ تمام سرکاری کارروائیاں بجائے عربی رسم الخط کے،جس میں اردو لکھی جاتی دیوناگری رسم الخط میں ہونی چاہئیں جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے۵

درج بالا اقتباس پیش کرنے کا مقصد ہندوؤں کی اس ذہنی کیفیت اور خیالات کو بیان کرنا تھا جو دراصل مسلم قوم کے کلچر کے خلاف محاز آرائی پر مبنی تھا،اس بات کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اردو رسم الخط کے مقابلے میں دیوناگری رسم الخط کے اجرا کا مقصد دراصل مسلم تشخص کے خاتمہ تھا،اس بات کی تائید تحریک آزادی میں ہر سطح پر پیش کیے جانے والے بیانیے سے بھی عیاں ہے جب ہر ایک موقع پر تحریک آزادی کے رہنماؤں نے ببانگ دھل یہ اعلان کیا کہ مسلمان نہ صرف مذہب کی بنیاد پر ایکا الگ قوم ہیں بلکہ زبان کے اعتبار سے بھی ان کی الگ پہچان موجود ہے

قومی تشخص کی تشکیل وارتقاء میں زبانوں کی اہمیت کی تائید میں جیلانی کامران کی یہ رائے پیش کی جاسکتی ہے

> تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ جہاں قومیت کی تشکیل ،قومیت کی نشوونما

اور قومی شعور کا ادراک مرحلہ وار ہوتا رہا ہے، وہیں اس عمل کے ساتھ ساتھ قوموں کی زبانیں بھی بتدریج نشوونما اور ارتقاء کے مراحل سے گزرتی رہی ہیں، زبانوں کے بغیر قوموں کی پہچان ممکن نہیں ہوتی اور قوموں کے بغیر زبانیں ناپید ہوتی ہیں۶

تحریک آزادی کے سفر کا مطالعہ کیا جائے تو موقع در موقع ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے قومی تشخص کی پہچان کے لیے زبان کی اہمیت کو ہر طرح سے اجاگر کیا گیا، مسلم لیگ کے ۱۹۳۷ء میں لکھنو میں منعقدہ اجلاس میں اردو زبان کو مسلمانوں کی قومی زبان قرار دیا گیا اور اردو زبان کی ترقی و ترویج پر آراء پیش کی گئیں ساتھ ہی اس کے تحفظ کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا

ہندوؤں کے دیوناگری رسم الخط کے نفاذ کی کوششوں سے مسلمانوں کو اپنے قومی تشخص کے زوال کی ناکام سازش کا اندازہ ہو چکا تھا، زبان کی لفظیات کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر سے جنم لینے اور انسانی ذہن پر اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جیلانی کامران رقم طراز ہیں کہ

اس امر سے بہت اختلاف ممکن ہے کہ لفظ کوئی بے جان شے نہیں ہے، لفظ جہاں ایک خارجی پیکر کے طور پر موجود رہتا ہے وہیں اس کے ذریعے انسان کے کردار کی تشکیل بھی ہوتی ہے، اس اعتبار سے لفظ اور انسان کا بنیادی رشتہ بنیادی نوعیت کا ہے، ہر زبان کی لفظیات اس زبان کے تہذیبی و تاریخی پس منظر سے پیدا ہوتی ہے، اس طرح ہر لفظ اس پس منظر کی نشان دہی کرتا ہے۷

اردو زبان کے نظریہ پاکستان کا حصہ بننے کی بابت تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ اردو زبان کو مسلم لیگ کی قراردادوں میں شامل کیا گیا، خود اردو ادب کا جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم تک شعر و ادب کا کام اپنی مثال آپ ہے

اردو ادب کے سلسلہ میں صوفیائے کرام کی مساعی، فورٹ ولیم کالج، سرسید مکتب، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق کی خدمات بھی اردو زبان کی ترویج میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، یہ ایسے پلیٹ فارمز تھے جن کی مدد سے تخلیقی ذہنوں کی آب یاری کی جاتی رہی جو بعد ازاں اردو ادب کے روشن ستارے بن کر نمودار

ہوئے

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ اردو زبان کی ترویج میں بعض ہندو تخلیق کاروں کا کردار بھی بنیادی نوعیت کا حامل ہے ،اس سلسلے میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، پریم چند وغیرہ کے کردار کو خراج تحسین پیش نہ کرنا بھی زیادتی متصور کیا جائے گا،اردو زبان کی عوامی سطح پر مقبولیت مذہب کی تفریق کے بغیر جاری و ساری رہی

تقسیم ہند تک مسلمانوں کا اردو زبان سے جذباتی لگاؤ قدرتی امر تھا،لیکن قیام پاکستان کے بات بعض ارضی مجبوریوں اور لسانی گروہوں کی مخالفت کی بنا پر اردو کو بطور قومی زبان رائج کرنے کا منصوبہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا، ہر چند کہ اردو کو قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا لیکن اردو کا قومی زبان کے طور پر علمی نفاذ ہنوز دلی دور است کے مصداق ہے

اردو کی ترویج اور مسلمانوں کے قومی تشخص کی بحالی میں سرسید احمد خان کا کردار تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا، سرسید احمد خان کی مسلم یونی ورسٹی جہاں بطور ادارہ مسلمانوں کی قومی وحدت کا علمبردار رہا اور قوم کی تشکیل کا باعث بنا تو وہیں علی گڑھ مغربی تعلیم کے حصول اور مغربی تہذیب و ثقافت سے تعلق کے بارے میں بنیادی اہمیت کا حامل رہا

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مغربی تعلیم کا حصول اور مغربی تہذیب و ثقافت سے آشنائی کا سر سید کا خواب و مساعی ،فقط مسلمانوں کی شامل اقتدار ہونے اور مسلمانوں کو ترقی کی دوڑ میں شامل کرنے سے مشروط تھا،سرسید کے ذہن میں وگرنہ مسلم قومیت کا جداگانہ تصور نہایت منفرد اور جامع نوعیت کا حامل تھا،اس بات کو انھوں نے ایک موقع پر یوں بیان کیا

> پہلا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی قومیت کا تصور اور قومی اتحاد جو ترقی کی راہ میں پہلا قدم ہے برقرار رہنا ضروری ہے اس کے حصول کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے اس سمت میں اٹھایا جانے والا پہلا قدم یہ ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور اسلام کی صحیح نوعیت کا احساس کریں،اس لیے ضروری ہے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو اسلام کی بنیادی

تعلیمات سے آگاہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان سے دینی فرائض ادا کرائے جائیں، اپنی قومیت کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ مسلم طلباء کو عربی پڑھائی جائے جو ہمارے مقدس دین اور آئمہ سابقین کی زبان ہے اور فارسی بھی پڑھائی جائے جو قومیت کی روایات کو زندہ رکھے گی۔۸

۱۸۸۵ء میں جن انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں لایا گیا تو سرسید نے اس کی کھل کر مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے یا اس کی حمایت کرنے سے منع کر دیا، یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سرسید مسلمانوں کی مذہبی، لسانی اور تہذیبی شناخت کو عزیز از جان رکھتے تھے اور مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے محافظ بھی تھے، ایک جگہ سرسید فرماتے ہیں:

ہمارا ملک ایک وسیع ملک ہے جس میں مختلف لوگ آباد ہیں جو نسلی اور مذہبی تضاد کے باعث ایک دوسرے سے الگ ہیں۔۹

سرسید احمد خان نے اپنی ساری زندگی مسلم امہ کے قومی تشخص کی بحالی، نمو اور ارتقا کے لیے وقف کر دی، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے قومی و ملی تشخص کے ساتھ زندگی بسر کریں، کانگریس کے قیام سے پہلے ان کی مساعی مسلمانوں کو مہذب قوم بنانے اور جدید علوم سے بہرہ ور کرنے پر مامور رہی، وہ صحیح لفظوں میں مسلمانوں کے ہمدرد تھے اور لمحہ بہ لمحہ مسلمان قوم کی خبر گیری کرنے والے رہنما تھے، قدرت نے انہیں دور رس نگاہ سے نواز رکھا تھا، ایک موقع پر مسلمانوں کو آئندہ کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

سب سے اول جو Critical مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ملک کا انتظام اور ملک کی سلطنت کس کی ہونی چاہیے اس وقت فرض کرو کہ تم تمام انگریزوں کی فوج ہندوستان کو چھوڑ کر چلی جائے اور اپنا توپ خانہ اور تمام عمدہ ہتھیار اور تمام چیزیں جہاز پر لاد کر جاویں تو ہندوستان میں کون حاکم ہوگا کیا ایسی حالت میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک گدی پر بیٹھ کر برابر درجے پر رہ سکیں گی ہرگز نہیں، ضرور ہوگا کہ دونوں میں سے ایک دوسرے کو دبا لے۔۱۰

۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکشنل کانفرنس، دراصل مسلمانوں کے الگ تشخص اور الگ قوم کی پہچان کے لیے

اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> ان کرداروں کا مزاج اس اسلامی عقیدے سے بنا ہے جہاں مایوسی کفر ہے۔ کسی بھی کردار میں عزم کی کمزوری اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اللہ کی ذات سے ذرا بھی مایوس نہیں ہوتا ۲۴

ناقدین ادب نے اردو داستانوں اور افسانوں میں زبان و بیان کی خوبیوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان میں اخلاقی اور روحانی موضوعات کا احاطہ بھی کیا۔ ''باغ و بہار'' کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

> باغ و بہار محض داستان نہیں بلکہ ایک روحانی تجربے کی تعیم ہے۔ اس کا اظہار اگرچہ علامتی ہے۔ چنانچہ عشق سے نفی انا کا اور سخاوت سے تقسیم ذات کا ذریعہ سامنے آتا ہے۔ درویش ساری جنگ نفسِ امارہ کے خلاف لڑتا ہے''۔ اردو نثر کے ارتقا میں انیسویں صدی کے داستانوی ادب کو معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی پس منظر کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں ان داستانوں میں اسلامی عقائد اور روایات کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔۲۵

شاہ اسماعیل شہید نے عربی زبان میں رد الاشـــراك کے نام سے ترکِ بدعت وشرکت کیلئے قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں، ایک رسالہ تحریر کیا جسے بعد ازاں تـقـویة الایمـان میں اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا، پروفیسر آسی ضیائی 'تقویة الایمان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> سرسید کی ادبی و فکری راہنمائی نہ ''باغ و بہار'' نے کی تھی نہ خطوط غالب نے، بلکہ صرف ''تقویة الایمان'' کو یہ شرف پہنچتا ہے۲۶

انیسویں صدی میں اردو نثر کے ارتقا کے مطالعہ میں سرسید کی نثر کا سلسلہ انیسویں صدی کی نثر سے جوڑا جاتا ہے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ نثر بنیادی طور پر دین اسلام کی ترقی کی غایت میں معرضِ وجود میں آیا۔ سرسید نے ''تفسیر القرآن''، علم الکلام کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ سرسید کے اس بے مثل کارنامے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ابن فرید لکھتے ہیں۔

> اس میں (خطبات احمدیہ) جو فطری بہاؤ اور جذبہ کی تہذیب ہے۔ وہ اردو نثر کو سرسید کے بعد صرف چند ہی لوگ عطا کر سکے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انیسویں صدی میں اردو کی معیاری اور اعلیٰ ترین کتاب خطباتِ احمدیہ ہے۲۷

وہ پلیٹ فارم ثابت ہوا جس کی منزل پاکستان کا قیام تھا، یہاں سرسید کا تذکرہ فقط ان کی ذات واحد تک محدود نہیں بلکہ سرسید سے مراد وہ تمام شخصیات ہیں جن کی مدد سے سرسید اپنی ذات میں ادارہ بن چکے تھے۔

ان شخصیات میں حالی اور شبلی کے قومی و ملی شعور سے کون واقف نہیں، کہ ان دو حضرات کی تحریروں سے مسلم امہ نے اس وقت جادہ منزل پایا، مسدس حالی مسلمان قوم کے زوال کی وہ منظوم داستان ہے جس میں آئندگان کے لیے بھی سبق کے سلسلے موجود ہیں، اس نظم میں جہاں مسلمانوں کے عظیم ماضی کی داستان موجود ہے وہیں ہندوستان میں موجود مسلم قوم کی پہچان کی دکھائی دیتی ہے

> مسدس حالی کو ایک نگاہ دیکھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ اسلاف کی عظمت رفتہ کا علاقہ ملت اسلامیہ کا جغرافیائی خطہ ہے جس میں حالی نے مسلمانوں کے عظیم تر عکس کو پھیلایا ہے اور اس عکس کے آس پاس ماضی کی زنجیریں ڈال دی ہیں، جہاں سے صرف دیکھا اور اس کی تاریخی شہادت کو محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن وہ علاقہ جہاں سے آج شروع ہوتا ہے اور اسلاف کے جانشینوں کے آشوب کی ابتدا ہوتی ہے اس دریائے گنگا سے منسوب کیا گیا ہے[11]

سرسید تحریک سے وابستہ محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے نام سے کون واقف نہیں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات، مسلمانوں میں انقلابی روح بیدار کرنے کی ہی تو عظیم مساعی ہیں مولانا ظفر علی خان کی نظموں نے بھی مسلم شعور کی بیداری میں خوب کردار ادا کیا۔

بیسویں صدی کا آغاز ہی دیکھ لیجیے، کتنے ہی ایسے نام ہیں جو اپنے حصے کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں، ان میں ایک نام تو ہمارے قومی شاعر جناب حضرت علامہ اقبال کا ہے، اقبال کی شاعری کی ابتدا تو ایک قوم پرست ہندوستانی کے طور ہوئی لیکن وہ جلد ہی اس محدود دائرے سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے ان کی نظم ہمالہ (بانگ درا) ہندوستان کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہے، اور جذبہ حب الوطنی کو مہر لگاتی نظر آتی ہے۔

قیام یورپ کے دوران اقبال کی فکر میں نمایاں تبدیلی واقع ہوتی نظر آتی ہے، اس عمل میں ایک تو ان کے مطالعے کی وسعت کا کردار نمایاں ہے دوسرا وہ ملت اسلامیہ کے وسیع تر دائرے کو سمجھنے اور اس کو بیان کرنے پر تیار نظر آتے ہیں، چنانچہ اپنے ایک مضمون بعنوان. ملت اسلامیہ پر ایک عمرانی نظر. میں وہ لکھتے ہیں کہ:

مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن ،نہ اشتراک اغراض اقتصادی بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ بظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں

اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت موجود ہے اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ اور شمائل مختصہ پر نہیں ہے،غرض اسلام زمان ومکان کی قید سے مبرا ہے۱۲

اقبال قومیت کے تصور کی روشنی میں ہی ایک الگ مملکت خداداد کا مطالبہ کرتے ہیں ، انھوں نے اپنے نظریات سے مسلمانوں کو اسلام کی اصل روح کے قریب لانے اور ان کے اسلامی تشخص کے تحفظ کے لیے ،سیاسی طور بھی حصہ لینا شروع کیا،۱۹۳۰ء کا خطبہ الہ آباد تاریخ کے اوراق میں اسی موضوع کو محیط ہے،اقبال مغرب کے نظریہ قومیت سے بھی اختلاف رکھتے ہیں ،چنانچہ ملت اسلامیہ پر ایک عمرانی نظر میں ایک جگہ فرماتے ہیں

ہمارے تصور قومیت کی بنیاد مذہب ہے اور مذہبی اعتقادات کی وحدت کا انحصار اسلامی تمدن کی یک رنگ پر ہے یہ یک رنگی تمدن ہے۱۳

(۷).اسلام کا تصور انسان:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا مگر انسان اپنے اعمال کی بنیاد پر درجہ بہ درجہ اپنے مقام سے گرتا چلا گیا۔جنگل کی زندگی سے انسانی زندگی کے آغاز نے انسان کو جوں جوں مہذب بنایا۔توں توں انسانی شعور کی منازل طے کرنے لگا۔حتیٰ کہ اس کا ذہن کائنات اور اس کی موجودگی کے سوالات سے ہوتا ہوا خود اس کی ذات تک پھیل گیا کہ آخر انسان کی اپنی کیا حیثیت اور مرتبہ ہے۔قرآن اس بارے میں انسان کی یوں رہنمائی کرتا ہے۔

اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر جس نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر تجھ کو برابر کیا

جس صورت چاہا تجھ کو جوڑ دیا[۱۴]

قرآن اور انسان کا تعلق بنیادی نوعیت کا ہے۔ قرآن میں انسان کی پیدائش، اسباب اور اس کے فرائض اور ذمہ داریوں تک کا بیان آیا ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے اس دنیا سے جانے کے بعد ملک کے معاملات کا بیان قرآن کے موضوع ہیں۔ مسئلہ جبر و قدر ہو کہ دعا کی قبولیت، عبادت و ریاضت کے مسائل ہوں یا معرفت کے مقامات، دنیاوی زندگی ہو کہ اخروی زندگی، قرآن لحہ بہ لحہ، قدم بہ قدم انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق اللہ نے انسان کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب مقرر کیا ہے۔ فرشتوں سے سجدۂ تعظیمی کروایا گیا۔

کائنات میں انسان کو خلافت کی خلعت سے نوازا گیا ہے اور تمام مخلوقات اور زمین و آسمان کو انسان کے لیے تسخیر گاہ بنایا گیا ہے۔ اب یہ انسان تک ہے کہ وہ اپنے روز و شب کو کن مقاصد کے لیے استعمال میں لائے۔

مظاہر کائنات کو انسان کے تصرف میں دے کر رب کریم نے اسے زمین میں اپنی نائبیت کا اعزاز بخشا مگر خود اپنی ذات میں انسان پر پابندی لگائی کہ مجھ (اللہ) کے ساتھ کسی کو شریک مت بنانا اور میرے احکامات پر زندگی بسر کرنا۔ میں کائنات کے راز تیرے کہنے پر ظاہر کر دوں گا۔ اسلامی نظامِ حیات اور اسلامی اصول ہائے طرزِ حیات پر عمل پیرا ہو کر انسان زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

مذاہب عالم میں طرزِ حیات کا پہلو تشنگی کا شکار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام کو کامل نظام حیات کا نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ جب ہم اسلامی نظام حیات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ اسلامی اسباق ہائے حیات میں زندگی کے ہر لمحے کے متعلق مکمل راہنمائی میسر ہے۔

(vi). اسلامی نظام حیات کی خوبیاں:

۱۔ اسلامی نظام حیات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی انسان کا بنایا گیا نظام نہیں ہے بلکہ رب کائنات نے خود اسے ترتیب دیا ہے۔

۲۔ اسلامی نظام حیات منظم ضابطہ پر مشتمل ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ اور پہلو، اسلام کے نظام حیات سے ٹکراؤ کا شکار نظر نہیں آتا بلکہ انفرادی و اجتماعی سطح پر بھی اسلامی نظام حیات انسان کی مکمل راہنمائی کا باعث ہے۔

۳۔ رب کائنات کے وضع کردہ نظام اور انسانی وضع کردہ نظام میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی فلسفے محض زندگی کی

خارجی تبدیلیوں سے انقلابی تبدیلیوں کے متمنی ہیں۔ جبکہ اسلام فکر ونظر اور دل و دماغ کی تبدیلی کا داعی ہے کہ جس کا مقصد نفس کی اصلاح ہے۔

۴۔ اسلامی نظریہ حیات دین و دنیا کو الگ الگ نہیں رکھتا بلکہ ترک دنیا کا بھی مخالف ہے۔

۵۔ اسلامی نظریہ حیات کی یہ خوبی بھی ہے کہ اس کی تعلیمات انفرادیت واجتماعیت کا درس دیتی ہیں۔

۶۔ اسلامی نظریہ حیات مبہم نہیں ہے بلکہ آسان مبہم ہے جو ہر عام وخاص کی سمجھ میں آجاتا ہے۔

۷۔ اسلامی نظریہ حیات فقط سبق تک محدود نہیں بلکہ عملی اقدام کا خواہاں ہے۔

(vii). اسلامی ریاست اور بنیادی انسانی حقوق:

اسلام میں رائج رعایا کا مفہوم اور دنیاوی رعایا کا مفہوم میں بنیادی فرق اس بات کا ہے کہ دنیاوی نظام میں رعایا سے مراد کسی ریاست کے اندر جغرافیائی حدود کی پاسداری کرتے ہوئے ،متعلقہ ملک کے قوانین کے تحت زندگی بسر کرنا ہے۔ جبکہ اسلام، تمام بندگان کو مخاطب کر کے خدائے واحد کی زیرنگرانی اور احکام الٰہی کے تحت زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق کی مکمل پاسداری اسلامی نظام حیات کی بنیادی شرائط میں شامل ہے۔

(viii). اسلامی نظریہ حیات کے تحت مسلمانوں کے حقوق:

۱۔ جینے کا حق

۲۔ معذوروں اور کمزوروں کا حق

۳۔ خواتین کے حقوق

۴۔ معاشی تحفظ

۵۔ عدل وانصاف

۶۔ مساوات کا حق

۷۔ گناہوں سے بچنے کا حق

۸۔ ذاتی ونجی زندگی کا تحفظ

۹۔ عزت وناموس کی حفاظت

۱۰۔ ظالم اور مظلوم کا بنیادی فرق اور حقوق

۱۱۔ عقیدے کی آزادی کا حق

(ix). غیر مسلموں کے بنیادی حقوق:

۱۔ جان کی حفاظت

۲۔ عزت کا تحفظ

۳۔ مذہبی مراسم کی آزادی

۴۔ عبادت گاہیں بنانے کا حق

(x). اردو ادب میں اسلامی رجحانات کا جائزہ:

اردو شعر ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اردو ادب میں اسلامی رجحانات کم و بیش ہر ایک تخلیق کار کے ہاں موجود ہیں۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ کسی تخلیق کار کے ہاں یہ رجحانات بہت واضح انداز میں سامنے آتے ہیں اور کسی کے ہاں علامتی پیرائے میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اردو ادب کے ان تخلیق کاروں کے ہاں اسلامی رجحانات کا یہ سلسلہ شعوری اور غیر شعوری صورتوں میں نمو پذیر رہا ہے۔

اردو ادب کا بیشتر ماخذ عربی اور فارسی زبان رہی ہے اور عربی و فارسی سے لسانی ماخذات کا سلسلہ بھی اردو زبان میں بہت نمایاں ہے۔ دوسرا برصغیر میں وارد ہونے والے مسلمان اوباء کی اکثریت عرب و ایران سے تعلق رکھتی تھی۔ جو اپنے ساتھ اسلامی ثقافت کا ایک وسیع ذخیرہ ہراہ لائے۔ پھر صدیوں پر محیط اس سلسلے میں برصغیر کی آب و ہوا کا ذائقہ بھی شامل ہونے لگا۔

اردو ادب کی ترویج میں صوفی کا تذکرہ نہ کرنا، تاریخ اردو ادب کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ صوفیائے کرام اشاعتِ دین کی غرض سے برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور اپنے تخلیقی جوہر کی مدد سے اردو ادب میں بے پناہ علمی و ادبی سرمایہ فراہم کر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر خسرو سے لے کر آج تک اردو ادب میں ایسی بے شمار ہستیوں کا ذکر ملتا ہے جو اسلامی پس منظر کے ساتھ اردو ادب میں وسعت کا باعث ہے۔

(xi). شخصیات:

اردو شعراء اور تحقیق کاروں میں اکثر ایسے افراد کے بارے میں تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ وہ اردو ادب سے

وابستہ ہونے کے ساتھ باقاعدہ کسی صوفی مسلک سے بھی وابستہ تھے۔ اس سلسلے میں امیر خسرو، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جان جاناں، میر تقی میر وغیرہ جیسی شخصیات کی ایک ایسی فہرست مرتب کی جاتی ہے۔ مگر یہاں فقط ان ناموں پر اکتفا کرتے ہوئے بات آگے بڑھا دینا ہی مقالے کا مقصود ہے۔

(xii). اصناف سخن:

اردو اصناف سخن کا جائزہ لیا جائے تو بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ موضوعاتی وفکری اعتبار سے اردو اصناف سخن میں اسلامی رجحانات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اردو غزل میں متصونانہ خیالات کی موجودگی اس کا ایک زاویہ پیش کرتی ہے ۔خود اردو نظم میں اسلامی رجحانات کی عکاسی کا سلسلہ علامہ اقبال، حالی اور دوسرے شعراء کے ہاں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

اردو مرثیہ میں واقعہ کربلا کو ایک تاریخی حیثیت سے بیان کرنے کی روایت دکن کی اردو ادب کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ اردو مرثیہ میں مرزا دبیر اور میر انیس امام مرثیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ مناقب کے لحاظ سے بھی اردو منقبت کا سلسلہ اسلامی رجحانات کی ایک بڑی مثال اور دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے

تاریخ اردو ادب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ اردو زبان ادب کے ارتقا میں صوفیائے کرام کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ شاہ عبدالقادر، شاہ اسماعیل شہید اور شاہ رفیع الدین وغیرہ جیسے صوفیا و علما کی تحریریں بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

انیسویں صدی میں مناظراتی ادب کا ذکر کیا جائے تو اردو نثر اور اردو زبان کی ترقی میں اس کے کردار کو بنیادی اہمیت نظر آئے گی۔ 1850ء کے بعد اور مقالے سرسید کی تحریریں بھی اس فن میں اردو نثر کے فروغ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

شبلی نعمانی، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی، الطاف حسین خاکی اور سید سلیمان ندوی وغیرہ ایسی شخصیات ہیں جن کے ادبی کارناموں کا تذکرہ کیے بغیر سرسید تحریک اور انیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔

برصغیر میں تمام مذاہب کی ترویج اور ان کے فکری سرمائے کی تشکیل میں اردو زبان کا کردار تاریخی حیثیت رکھتا

ہے۔ مگر اسلامی فکر کو دیکھا جائے تو برصغیر میں اسلامی فکر کے رجحانات کا فروغ دراصل اردو زبان ہی کی دین ہے۔ لیکن اگر دوسرے مذاہب جو کہ برصغیر میں قائم رہے ہیں ان کی فکری شناخت اور ترویج اردو زبان ہی کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔

اردو ناقدین کی اکثریت نے اس زاویہ نظر سے اختلاف برتتے ہوئے اردو نثر میں مذہبی رجحانات کو اہمیت نہیں دی۔ دیکھا جائے تو یہ ایک عظیم انسانی سرمایہ تھا جسے ناقدین ادب کی تنگ نے ضائع کر دیا۔ اردو نثر میں اسالیب کا جائزہ لیا جائے تو بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اردو کی نثر کی درج ذیل چار صورتیں مقدر ہوتی نظر آتی ہیں۔

۱۔ اردو نثر کا روایتی اسلوب جسے علما نے فروغ دیا اور جس میں ندرتِ اسلوب کا اس قدر خیال نہ رکھا گیا جو بعد ازاں اردو نثر کا حصہ قرار پایا۔ ایسے اسلوب میں مواد اور معنی ہی کو زیادہ اہمیت بخشی گئی۔

۲۔ اردو نثر کا اگلا دور سرسید اور ان کے رفقا کی نثری تحریروں سے متعلق ہے۔ سرسید دور کے نثری نمونے سادگی، سلاست اور مقصدیت کے حامل تھے۔ اس دور کی نثری کاوشوں میں مذہبی ادوار کے ساتھ ساتھ معاشی، معاشرتی، سیاسی اور علمی موضوعات کو سپردِ قرطاس کیا گیا۔ مغربی ادب سے استفادہ اور مغربی ادب و زبان کے اسلوب کو اردو ادب میں سمونے کی کوشش بھی اس دور کی نثر کا خاصہ رہا۔ لیکن اس دور میں بھی مذہبی اور اسلامی فکر جاگزیں رہی۔

۳۔ اردو نثر کے تیسرے دور میں شبلی کی تحریریں اردو نثر میں ایک اور سنگِ میل ثابت ہوئیں۔ سرسید دور میں انگریزی، الفاظ اور اسالیب کے برعکس شبلی کے اسلوب میں عربی اور فارسی ادب سے استفادہ نظر آتا ہے۔ سرسید نے شعوری، غیر شعوری طور پر وکٹورین عہد کے ادب کو معیار سمجھا تو شبلی کے سامنے عباسی دور کی تہذیب اور فارسی و عربی ادب بطور معیار، ان کی تحریروں میں ہے۔

۴۔ اس دور میں چوتھی شخصیت جس نے اپنے اسلوب کو جداگانہ بناتے ہوئے درج بالا تینوں روایات سے ہٹ کر اردو نثر میں اپنی منفرد طرزِ تحریر سے روشناس کروایا وہ مولانا ابو الکلام آزاد ہیں۔ ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات میں خطابیہ اور رومانوی اندازِ تحریر ہے۔ ان کی تحریروں میں عربی و فارسی تراکیب نے اردو نثر میں وسعت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر ان تراکیب کے استعمال میں بھی وہ بہت محتاط انداز سے اردو نثر کو بوجھل پن سے آزاد رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب دکھائی دیئے۔

مولانا مودودی کی تحریروں کے ذکر کے بغیر اردو نثر کے ارتقائی سفر کا جائزہ نامکمل رہے گا۔ مولانا کی نثر علی گڑھ سکول اور شبلی کی نثری روایت کا جامع موقع ہے۔ دینی روایات میں ان کا اسلوب تشبیہ و ثقیل سے مزین ہے۔ مولانا کی تحریر کا ایک اور خاصہ ان کی تجاریر کی تازگی اور شگفتگی کا عنصر ہے۔ جس میں غیر معمولی ادبی حسن نمایاں ہے۔

ب۔ اسلامی ادب کی روایت اور اردو ادب:

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی اصطلاحات دو الگ الگ ادبی رویّوں کی غماز ہیں۔ اگرچہ اسلامی ادب کی اصطلاح بعض حضرات کے لیے نئی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اسلامی فکر، معاشرے کی مجموعی صورت حال میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی خاص مظہر کی علامت بن کر سامنے آئی۔ اس سلسلے میں پروفیسر ہارون الرشید لکھتے ہیں۔

> اسلام ہمیں ایک خاص نظریہ زندگی عطا کرتا ہے جو دنیا کے دوسرے مذاہب اور اقوام کے نظریات سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو اسلام کے پابند ہوں گے ان کی زندگی کے نظریات و مقاصد بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہوں گے اور ان کا ادب بھی انہی نظریات و مقاصد کا ترجمان ہوگا ۱۵

اسلامی ادب کیا ہے اور اسلامی نظریات ادب میں فکری و سماجی تبدیلیوں کا مظہر کیسے بن سکتا ہے۔ ان بنیادی سوالات کو جواب اسلام اور تعلیمات اسلام کے غائر مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلام ایک مذہب ہی نہیں۔ ایک جامع نظام حیات کا عکاس بھی ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے شب و روز سے لے کر ماضی و حال اور مستقبل تک کے تمام موضوعات اسلام کی تعلیمات کا عنوان ہیں

حق اور حسن سے مرکب اسلامی تعلیمات دراصل ایسا نصب العین ہے جس کی تفہیم میں اسلامی ادب اپنے قارئین کو فقط معاشی حیوان بننے سے روکتا ہے اور انہیں اخلاقی وجود کی تمام تر خصوصیات سے مزین کرتا ہے۔

اسلامی ادب کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک تعمیری اور ترکیبی ادب ہے۔ جس میں فکر و فن کی اخلاقیات اور جمالیات مکمل طور پر ہم آہنگ اور مدغم ہیں۔ دیکھا جائے تو اسلامی ادب کی یکسوئی و یک جہتی تصور توحید کی عکاس اور دین ہے۔ اسلامی ادب اور اس کی تفہیم و تشریح کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ کچھ یوں رقم طراز ہیں۔

> میری رائے میں زیادہ موثر آواز اسلامی ادب کی ہے جس کے ترجمان اسلام کے مخصوص تصورات

کے مطابق ایک ایسے ادب کی تشکیل کے داعی ہیں جو اسلامی اقدارِ حیات کی ترجمانی بھی کرے اور ان کی تبلیغ بھی کرے

زیرتبصرہ زمانے میں اسلامی ادب کی بحث خاصی دیر تک جاری رہی جس میں کئی اہل افکار نے حصہ لیا۔ ان میں خصوصی ذکر کے قابل ڈاکٹر احسن فاروقی اور فراق گورکھ پوری کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ سعید احمد رفیق اور جماعت اسلامی کے ترجمان نعیم صدیقی، ماہر القادری اور ابوالخطیب اور دیگر حضرات نے بھی اپنے اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی کی اور اسلامی ادب کا جواز ثابت کیا ہے۔ نوجوان نقادوں میں پروفیسر جیلانی کامران نے ایک فکر انگیز تصور پیش کیا۱۶

درج بالا اقتباس میں ڈاکٹر عبداللہ نے اسلامی ادب کی اہمیت، افادیت اور اسلامی ادب کی ترویج میں نمایاں کرداروں کا ذکر بڑے احسن انداز میں پیش کیا۔ اسلامی ادب کے حوالے سے سعادت اکبر خان کی رائے ملاحظہ ہو۔

ہر صنفِ ادب سے جس طرح اسلامی و اخلاقی اقدار کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تنقید کے فن میں بھی اسی بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ادب پارے کی جن خصوصیات کو محاسن کا درجہ حاصل ہے۔ ان میں اسلامی و اخلاقی اقدار کو نمایاں مقام دینا چاہیے۔ جی سن ادب کا معیار جہاں صداقتوں، حقیقتوں اور ادبی لطافتوں کو قرار دیا جاتا ہے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی و اخلاقی اقدار کو نہ صرف یہ کہ سراہا جائے بلکہ معیار اوّلین کا درجہ دیا جائے اس سے یقیناً اعلیٰ و عظیم ادب تخلیق ہوگا جو قلب انسانی کے تقاضوں کا آئینہ دار ہوگا۔ ایسے ادب سے یقیناً ایک معقول و موزوں اور مناسب معاشرہ تشکیل پائے گا۱۷

درج بالا اقتباسات سے جہاں اسلامی ادب کی تفہیم میں آسانی بہم ہوتی ہے وہیں اسلامی ادب کی اہمیت اور معاشرتی و سماجی سطح پر اس کی افادیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانے میں بھی مدد فراہم ہوتی ہے کہ اسلامی ادب کے فروغ میں معاشرے اور سماج کی اہمیت کس قدر ہے، جس میں وہ ادب کو ایک ایسے آلہ کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں جس سے اسلام کی تعلیمات کے مطابق تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام پا سکے۔

(i). اسلامی ادب کا منصب اور تعامل:

اسلامی ادب والوں کا نظریہ حیات اس نصب العین کے عین مطابق ہے کہ جو مذہب اسلام فراہم کرتا ہے۔ اس

سلسلے میں اسلامی ادب کے منصب اور تعامل کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے کیونکہ اسلامی ادب نے کئی سطوح اور حیات سے اس کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ ذیل میں اسلامی ادب کے تحت لکھنے والوں اور اسلامی ادب کے منصب اور تعامل پیش ہے۔

۱۔ اسلامی ادب، ایک ادیب کے شعور میں وسعت پیدا کر کے اس کے ذوق میں وحدت کا عنصر پیدا کرتا ہے اور اس کی سوچ کو منتشر ہونے کے بجائے ایک نقطے پر مرکوز ہو کر یکسوئی کے ساتھ اس کے اسلوب کو متعین کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

۲۔ اسلامی ادب، تخلیق کار اور قاری کے درمیان، وحدت خیال کے جذبے کے تحت، یگانگت کا پہلو اُجاگر کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

۳۔ اسلامی ادب چونکہ ایک ہی ماخذ سے اپنا مواد ترتیب دیتا ہے لہٰذا مواد اور ہیئت کی ثنویت کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح فکر و فن کی ہم آہنگی کی صورت میں آ جاتی ہے جس سے ایک ادیب کو کائنات اور حیات کے متعلق متعین اور واضح حقائق میسر آ جاتے ہیں۔ یا اس صورت ایک ادیب فن اور ہیئت کے تقاضوں کے عین مطابق یکسو ہو کر تخلیق ادب کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

اسلامی ادب، اسلامی اقدار کے تابع رہ کر فروغ پاتا ہے اور چونکہ اسلام آفاقی مظاہر کا حامل ایک ایسا مذہب ہے جو باقی ادیان اور مذاہب کا حریف نہیں بلکہ اپنے اندر وسعت اور گہرائی کا بہترین نمونہ ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کے قائم کردہ اخلاقی معاشی اور سماجی معیارات، آفاقی سطح پر مسلّم ہیں۔

تاریخ اسلام کا مطالبہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں ادب کی طاقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہر دور میں اپنے پیغام کو عام کرنے میں مدد حاصل کی ہے۔ اس کی ایک مثال آسمانی کتب اور صحیفے بھی ہیں جو اپنے اپنے ادوار میں معیار ادب کے اعلیٰ ترین معیارات سے بھی بلند و بالا مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ آفاقی اور ابدی مقام کے حامل بھی ہیں۔ یہی نہیں کہ یہ آسمانی کتب اور صحیفے اپنے مخصوص دور میں ادبی و آفاقی سطح پر مسلّمہ رہے بلکہ آج کے دور میں اور قیامت تک اپنا ثانی نہیں رکھتے

اس سلسلے میں ان آسمانی کتب مثلاً انجیل مقدس اور قرآن مجید میں تمثیل کے انداز میں دعوت و تبلیغ کا جو حسین انداز سامنے آتا ہے۔ اور کنایات اور استعارات کا جو نظام ان کتب میں دیکھنے کو ملتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ساتھ ہی ان کتب اور صحائف میں دعاؤں کی صورت جذبات کے اظہار کے لیے جو اسالیب سامنے آتے ہیں ان میں نغمگی اور گہرے احساسات جس طرح جلوہ گر ہیں وہ سرمایہ ادب کو ایک حسین اور منفرد جہت عطا کرتے ہیں۔

ایک ادیب جس طرح تمام معاشی ناہمواریوں / اپنی درج ذات کے گمنام گوشوں کو اور اپنے اقتباسات اور خیالات کو اور اپنے مشاہدے کو تخلیق کے مرحلے سے گزار کر فن پارے کی صورت عطا کرتا ہے / بالکل اسی طرح علم معاشرے میں ادیب اور بالخصوص مسلم ادیب تمام باطل عقائد، افکار اور جذبات سمیت ایسی تمام روایات، تہذیب و تمدن کے خلاف قلمی جہاد کا علمبردار ہوتا ہے جو اس کے مشاہدے تجربے یا علم میں آجائیں۔ ایسے ادیب کے پیش نظر جہاں اس کی مذہبی اقدار ہوتی ہیں وہیں فلاحِ انسانیت کا عظیم مقصد بھی اس کے پیش نظر ہوتا ہے کہ اپنی کوشش میں تمام انسانیت کی بھلائی مقصود کی جاتی ہے۔

جہاں تک اسلامی ادب کا تعلق ہے تو اسلامی ادب سے وابستہ ہر ایک تخلیق کار، نظریہ اسلام سے اساسی اُصول اخذ کر کے اپنے حسن عمل اور کردار میں ندوت اور جمال پیدا کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے، بہترین، موزوں الفاظ اور دلکش اسلوب اسکی تحریر کا خاصہ بن جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال صرف اعتراضی صورتِ حال تک محدود نہیں بلکہ اختلافی صورتِ حال میں بھی یہی بیان کردہ لوازمات اسلامی ادب اور اس سے وابستہ ادیبوں کا خاصہ رہے ہیں۔

اسلامی ادب اپنا تمام تر مواد اور رہنمائی قرآن و حدیث سے لیتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ایسا ادیب جو بے مقصد تفریح اور انسانیت کو فرائض اور ذمہ داریوں سے غافل کر کے فحش گوئی میں مبتلا کرے اور فکر و نظر کے توازن کو عدم استحکام کا شکار کرے، قابل قبول نہیں۔

اسلامی ادب، آفاقی مظاہر کا علمبردار ہے، محض جنس اور روٹی کے مسائل تک محدود مضامین اس کا خاصہ نہیں۔ شعر و ادب ہو یا فنون لطیفہ کی کوئی اور صورت، ایسی تمام تخلیقات، جو نفسی خواہشات، جنس اور روزی روٹی کے مسائل کے بیان تک محدود ہوں اور جزوی مسائل کو ہمہ گیر مسائل سے بڑھا کر پیش کریں۔ اسلامی ادب ان کی تمام مخالفت کا علمبردار ہے۔ اسلامی ادب کے مطابق ایسے تمام اسالیب، جو ادب کی آڑ میں آدمی کو نفسانیت میں مبتلا کر دیں اور جو سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ ان کی مخالفت ضروری ہے۔ ویسے تو فحاشی اور بے حیائی کی تعریف معاشرے اور ماحول کی مناسبت سے مشروط ہے اور ہر معاشرے میں اس کی تعریف کا معیار جدا جدا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک فحاشی اور بے حیائی کی جامع تعریف سامنے نہ آسکی۔

قرآن اور دین اسلام کی بیان کردہ فحاشی کی تعریف اور حیا کے مقرر کردہ پیمانوں کی روشنی میں ایسے ادیب پرے درجے کے دشمنانِ انسانیت ہیں جو معاشرے کو فحاشی کے راستے پر گامزن کر دیں بلکہ اسلام ایسے لوگوں کو مجرم قرار دیتے ہوئے نفرت کا حقدار اور سزا کا مستحق بھی قرار دیتا ہے۔

درج بالا بحث کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسلام تنگ نظری اور رہبانیت کا قائل ہے اور انسانی زندگی میں جمالیاتی اقدار کا منحرف ہے۔ بلکہ اسلامی ادب درحقیقت دین اور دنیا کے توزن کی عمدہ مثال پیش کرنے کا قائل ہے۔ دین اسلام، دین فطرت ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تمام تعلیمات بھی فطری تقاضوں سے ہم آہنگ اور مملو ہیں۔ مگر حدود سے تجاوز کر جانے اور فقط نفسانی خواہشات کے مقابلے میں آفاقی اقدار اور عظیم تر مقصد حیات کی تلاش اور اس پر عمل پیرا ہو جانے کا درس دیتا ہے۔ یہی فکر و عمل کا سلسلہ اسلامی ادب اور اس سے وابستہ ادیبوں کے ہاں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

دین اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ابدی اور اٹل حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام کی تعلیمات سراپا جمال ہیں جن کا مقصد انسانی زندگی کو حسن و جمال کی رعنائیوں سے مزین کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیمات انسانی خیالات، بول چال، نشست و برساخست، میل جول اور سیرت و کردار اور تمدن و تہذیب کی مجموعی صورتِ حال کو حسن و جمال سے مزین کرتی ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اسلامی تعلیمات کا یہ روّیہ فقط فنونِ لطیفہ، آرٹ یا زندگی کے کسی ایک گوشے کو محیط نہیں بلکہ یہ حیات انسانی کے کل کو محیط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تعلیمات میں سطحیت کے بجائے گہرائی اور گہرائی کا عنصر نمایاں ہے۔ بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی بلکہ اسلام اور فلسفہ اسلام، فلسفہ جمالیات میں انسانی جسم سے آگے انسانی روح میں بھی جمالیات کو سراپا صورت عطا کرنے کا داعی ہے۔ فلسفہ جمالیات اسلام کی ایک چھوٹی سی مثال اس کا صفائی کو نصف ایمان کا درجہ عطا کر دینا ہے۔ بلکہ ایک اور مثال دیکھئے کہ اسلامی فلسفہ ءِ جمال، مسکرا کر دیکھنے کو صدقہ ادا کرنے کے عمل کے مترادف قرار دیتا ہے۔ اور خوشبو کی اہمیت اور فضائل کا تذکرہ بھی فلسفہ جمال اور اسلام کی ایک عمدہ مثال کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اردو ادب میں اسلامی رجحانات کی بابت، ایسی بے شمار کتب، علمی و فنی موضوعات، تراجم اور عربی و فارسی تذکرے، اسلامی ادب، اسلامی آرٹ اور ماضی و حال میں اسلامی ادب اور موضوعات کے تحت تخلیق کیا جانے والا

ادب اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اسلامی رجحانات اور موضوعات، اردو ادب میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

اسلامی ادب کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ جس میں اس کی ایک صورت کلاسیکی ادب اور دوسری صورت انقلابی یا تعمیری ادب کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ فروغ احمد کلاسیکی اسلامی ادب کی بابت لکھتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:۔

> اسلامی ادب وہ ادب ہے جس میں اسلامی افکار و جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ قرآنی تعلیمات، آثار، تاریخ و سیر اور سفر نامے، ملفوظاتِ اولیاء، بزرگوں کے تذکرے، حمد و نعت، منقبت، عقائد و مراثی، مثنویات، میلاد نامے، نور نامے، معراج نامے، قصص اور اخلاقی حکایات؛ غرض یہ کہ اس نوع کے سارے کلاسیکی سرمایہ ادب کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو اس میں رطب و یابس سبھی کچھ ملے گا، عجمی و یونانی تصورات کو الگ کرنے کے بعد اس میں آپ کو بہت کچھ خالص اسلامی افکار و جذبات ہی کا غلبہ نظر آئے گا۔
>
> اس قدیم سرمایہ کے فن پاروں کی تخلیق کرنے والی شخصیتیں عرب و عجم، ہندو و اندلس اور مصر و بربر کی وہ عظیم شخصیتیں ہیں۔ جن کے سرمایہ ءِ فکر و فن کا ایک بڑا ذخیرہ اردو میں منتقل ہوا۔ شمالی ہند اور دکن کے نثر نگاروں اور شعراء کرام کے طفیل قدیم یا کلاسیکی اسلامی ادب سے اردو میں جو کچھ منتقل ہوا، نیوز اس کے تفصیلی اور تجزیاتی جائزہ کا کام بھی نہیں ہو سکا۔ ۱۸

ج۔ اردو ادب اور مذہبی رجحانات کا ارتقائی / اجمالی جائزہ

تاریخ اردو ادب میں تعمیری اور تخریبی، روحانی یا مادی تصورات کی عکاسی اور جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کے آئینے میں، اردو ادب کے ارتقا کا اجمالی جائزہ ممکن ہے۔

شمالی ہند میں سترھویں صدی سے قبل اردو زبان کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ فارسی کی غالبیت کا عنصر بھی کم ہونے لگا تھا۔ لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ اس وقت تک اردو زبان کی اہمیت زیادہ نہیں تھی۔ حتیٰ کہ اردو نثر میں تحاریر کو بری نظر سے دیکھا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا کہ شاید ہی اردو لکھنے والے اس لیے اردو کو ذریعہ ءِ تحریر بناتے ہیں کہ انہیں فارسی نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان میں تذکروں کی صورت نیّر حسین کا ''تذکرہ الشعراء'' قدرت اللہ شوق کا '' طبقات الشعراء'' اور میر کا ''نکات الشعراء'' ملتے ہیں۔

اردو نثر میں مذہبی/اسلامی ادب کی پہلی کتاب دہ مجلس (کربل کتھا) کی صورت میں ملتی ہے۔ یہ کتاب شمالی ہند میں مذہبی مقاصد کی خاطر ترجمہ کی گئی۔ اس کتاب کا اصل متن فارسی میں ''روضۃ الشہداء'' کے نام سے کتابی صورت میں تھا، غور طلب نکتہ یہ ہے کہ فضلی اردو کی بجائے فارسی کے دلدادہ تھے مگر فارسی زبان کے عام فہم نہ ہونے کے باعث انہیں یہ کتاب اردو میں ترجمہ کرنا پڑی، یہ کتاب گرچہ اردو نثر کا باقاعدہ اسلوب کی نمائندہ ہرگز نہیں، مگر پھر بھی اس کتاب کو اردو نثر کی ابتدائی مذہبی کتاب کا شرف حاصل ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> فضلی اردو کی بجائے فارسی اسلوب سے زیادہ متاثر تھا، اس کے جملے گنجلک اور نثر کا اسلوب مقفیٰ ہے۔ چنانچہ اسے اردو کا نمائندہ اسلوب قرار دینا ممکن نہیں ۱۹

اردو ادب میں اسلامی ادب کی مثال کے ضمن میں شاہ مراد اللہ انصاری سنبلی کی کتاب پارہ غم کی تفسیر بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کا تاریخی نام ''خدائی نعمت'' ہے جبکہ یہ تغیر تفسیر مراد یہ کہ نام سے کئی بار چھپ چکی ہے۔ اس تفسیر کی تاریخی اور ادبی اہمیت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> تفسیرِ مرادیہ سے پہلے کوئی ایسی مفصل اردو تفسیر نہیں لکھی گئی تھی اسے قرآن مجید کی پہلی اردو تفسیر کہنا چاہیے۔ ۲۰

ڈاکٹر محمد ایوب قادری اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ

> شاہ مراد اللہ اور سپاروں کی تفسیر بھی لکھنا چاہتے تھے مگر نہ لکھ سکے کیونکہ ان کے شیخ طریقت مرزا مظہر جانِ جاناں نے منع فرما دیا تھا ۲۱

اٹھارویں صدی عیسوی میں کربل کتھا، نو طرزِ موضع، فارسی اسلوب کی نمائندہ کتب کی صورت میں اردو تراجم کی شکل ہمارے سامنے موجود رہیں تو دوسری طرف شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ مراد اللہ کے تراجم، آسان اور عام فہم زبان میں اردو زبان کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں مسلمانوں کی سیاسی و تہذیبی شکست اور زوال کو شاہ ولی اللہ کی تجزیہ کار نگاہ کا سہارا ملا۔ انہوں نے اس شکست و ریخت کے اسباب کی تہہ تک جان کاری حاصل کی اور نشاۃ الثانیہ کا پیغام دیا۔ انہوں نے اس موقع پر دینِ اسلام کی تبلیغ کو فرضِ عین سمجھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ پیش کیا۔ 25 برس

بعد آپ کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے اردو میں ''موضع القرآن'' کے نام سے قرآن کا ترجمہ کیا۔

شاہ رفیع الدین، شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ شاہ رفیع الدین کے قرآن کے ترجمے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> شاہ رفیع الدین نے سب سے پہلے قرآن پاک کا تحت لفظی ترجمہ اردو میں کیا اور سورۃ بقرہ کی تفسیر عام بول کی زبان میں لکھی جو تفسیرِ رمیضی کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔۲۲

یہاں قرآن مجید کے تراجم کا جائزہ اور ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان تراجم کی صورت میں اردو نثر کے ابتدائی نمونے، فارسی زبان کے اثر و رسوخ میں کمی اور اردو نثر کے فروغ کی ابتدائی صورتِ حال کا منظر نامہ پیش کرنا مقصود ہے۔

ان تراجم سے جہاں قرآن فہمی میں آسانی کے عمل کا آغاز ہوا وہیں اردو زبان کی ترویج اور ارتقاء کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ فارسی جو اپنی لفظیات، درباری وابستگی اور فارسی لکھنے اور پڑھنے والوں کی حمایت کنندہ زبان تھی، زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔

اردو نثر کا فروغ اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ شاہ ولی اللہ کے دونوں صاحبزدگان شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اردو تراجم کی ابتدائی ذمہ داری کو احسن انداز میں فروغ دیا۔ ہر چند کہ تراجم لفظی ترجمے کی ابتدائی شکلیں ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ اردو نثر کے ابتدائی زمانے ایسا کام کر دینا بھی موٹے شیر لانے کے مترادف مقصود ہوتا ہے۔ خداوند متعال ان عظیم ہستیوں کی سعی کاملہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین

اردو نثر کی ترقی اور ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کا کردار بھی بنیادی نوعیت کا ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھنے والے لکھاریوں کی تحریریں جہاں داستان، قصے اور کہانیوں میں اپنی مثال آپ ہیں وہیں اردو زبان اور ہند مسلم تہذیب کے فروغ میں بھی فورٹ ولیم کالج کا کردار مثالی نوعیت کا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقم طراز ہیں کہ

> تبلیغ اسلام کا جذبہ اکثر و بیشتر داستانوں اور افسانوں میں ایک مرکزی خیال کی حیثیت رکھتا ہے، افسانوں کے اہم اور بنیادی کردار ہمیشہ اسلام اور اس کی تعلیمات کے علمبردار ہوتے ہیں۲۳

اگر اس دور کی ادبی تخلیقات کا موضوعی جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ ان میں اخلاق و کردار، صبر و تحمل، محبت ایثار اور عزم و ہمت کے ساتھ ساتھ بنیادی اخلاقی موضوعات کو موضوعِ تحریر بنایا گیا۔

عہد سرسید اور سرسید سکول کے تحت اردو ادب کی ترقی، تاریخ کے اوراق میں درخشاں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا کے علمی، ادبی اور فنی اوصاف کی بدولت ہی اُس دور کے ادب نے بہت زیادہ ترقی کی۔ اس بات میں یہ پہلو زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ ان تمام ادباء نے اجتہاد کو دینی فکر سے لازم وملزوم اور کلی طور پر مشروط قرار دیا۔

یہ تمام سرسید کے طریقہ استدلال اور نظریہ عقلیت کے قتیل رہے لیکن ساتھ ہی وہ سرسید کے بعض ذہنی رجحانات مثلاً ان کی انتہا پسندانہ تعبیر وتفسیر کی روش وغیرہ کے حامی کبھی نہ رہے۔ بالفاظ دیگر وہ مذہبی اور دینی معاملات میں معتدل روّیے کے کاربند رہے۔ اس ضمن میں مولانا شبلی نعمانی کا نام بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

دیکھا جائے تو سرسید دینی معاملات میں انقلابی روّیے کے حامی تھے جبکہ مولوی نذیر احمد مصلح تھے، نذیر احمد نے ایسے وقت میں مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کے لیے قرآن مجید کا بامحاورہ اردو ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں۔

> نذیر احمد کا ترجمہ قرآن اس لحاظ سے انقلاب آفریں ضرور ہے کہ اس میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے اس میں محاورہ اور روزمرہ کے علاوہ جملوں کے دروبست کو اردو قواعد کا تابع کر دیا ہے، اس سے قبل قرآن پاک کے اردو تراجم میں عربی قواعد کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ۲۸

سرسید کے مذہب کے بارے میں انتہا پسندانہ یا انقلابی روّیے کے مقابلے میں مولوی نذیر احمد معتدل مزاج کے حامل تھے۔ اگرچہ نذیر احمد، سرسید کے سائنسی انکشافات کے قائل ضرور تھے مگر احیائے مذہب کے معاملے میں وہ سرسید سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔

اگر نذیر احمد کے ناولوں کا فکری وفنی جائزہ لیا جائے تو ان کے ناولوں میں حسن وعشق کے موضوعات کے برعکس مقصدیت، نصیحت، مناظرے کی صورت حال اور اسلامی افکار کی تبلیغ کی گئی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی پہلے پہل تو سرسید تحریک سے منسلک رہے مگر بعد میں اتحاد اسلامی تحریک کے پہلے مفکر کے طور پر اپنی جداگانہ حیثیت منوانے میں کامیاب ہوئے۔ شبلی کی زندگی کا مقصد یہ رہا کہ مسلمانانِ ہند میں تاریخی شعور پیدا کر کے احیائے اسلام کا کام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کی نثر کی مقصدیت، سرسید کے فلسفہ سیاست سے الگ اور جدا نظر آتا ہے۔

دراصل مولانا شبلی نعمانی اور ان کے ہم نوا ادیبوں نے اپنی مذہب فکر پوری طاقت کے ساتھ لوگوں کے سامنے رکھا۔

اس دور میں شبلی اور ان کے ہم مزاج ادیبوں کی یہ کوشش تھی کہ اسلام کو جدید سائنس کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے اور ان لوگوں کو اسلام کی حقانیت سے روشناس کروا کے ان کے دلوں میں مایوسی کے سائے ختم کئے جائیں اور ان کے دلوں میں اسلام کی تڑپ پیدا کیا جائے۔

با الفاظ دیگر سیاسی حالات کی وجہ سے مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی زندگی میں جو خلا در آیا تھا۔ اس خلا کو پُر کرنے کی ابتدائی مساعی شبلی ہی نے کی۔ اس سلسلے میں ان کی کتب سیرت النبی ﷺ ،سیرت النعمان ، الفاروق اور المامون مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف گوشوں کو پیش کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں

شبلی کے افکار اور اسلوب کے بیشتر پیروکار اردو ادب میں معتبر ہستیوں کی صورت سامنے آئے۔ ان ہستیوں میں ابو الکلام آزاد، سید سلمان ندوی اور مولانا مودودی کے اسمائے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کی رائے دیکھیے

> آزادی وطن سے بین المملیت تک کی جو ذہنی تحریکیں اردو ادب میں چلیں ان کا پیش رو شبلی کے سوا کسی اور کو نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال، ابو الکلام آزاد اور مولانا مودودی نے اپنے اپنے کارنامے اسی فضا میں سرانجام دیے، جو شبلی نے قائم کی تھی ۲۹

مولانا شبلی نعمانی کے اسلوب اور طرزِ تحریر کے بارے میں خورشید احمد کچھ یوں رقم طراز ہیں۔

> شبلی کی علمی روایت میں عقلیت، تاریخیت اور حرکیت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ نئے دور میں عقلیت کی روایت نے آزاد، اقبال اور مودودی کی تحریرات میں بالکل نیا آہنگ اختیار کیا۔ اور ایک نیا علم الکلام تیار ہوا جو سیاسی دور کی فضا میں نہیں بلکہ بیسویں صدی کے افکار و مسائل کے درمیان معرضِ وجود میں آیا۔ ۳۰

اردو نثر کے ارتقا میں دارالمصنفین کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ دارالمصنفین کا حلقہ تنقید کی طرف مائل رہا۔ اس ادارے کا رسالہ ''معارف'' علمی و ادبی خدمات کے لیے مثال کی حیثیت رکھتا ہے، دارالمصنفین کے بارے میں ڈاکٹر عبدالمغنی کی رائے کچھ یوں ہے۔

> اگر خالص ادبی تنقید کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اردو کے سب سے بڑے نقاد شبلی ہیں نہ کہ حالی اور ''شعرالعجم'' تنقید کی سب سے اہم دستاویز، ذوق اور شعور دونوں اعتبار سے حالی کے برخلاف شبلی

نے کچھ پیروی ءِ مغرب کی تلقین نہیں کی۔

مسلم نگاروں میں شبلی کے بعد آزاد کی تصانیف نے دینی لحاظ سے نئے علمی افکار کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ آزاد کی نثر کا مقصد بھی احیائے مذہب ہی تھا ۳۱

مولانا کی تحریروں میں مغرب کی پیروی کے برعکس سیرت نبوی ﷺ سے فیض یابی کے جوہر پارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ عقل کے بجائے عشق اور وجدان کے حامی تھے، ہر چند کہ یہ طرز ادا شبلی اور اکبرالہٰ آبادی کے ہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے مگر مولانا نے مذہب عقل کے مقابلے میں مذہب عشق کی تجدید نو کا فریضہ احسن انداز میں انجام دیا۔

احیائے اسلام کی تاریخی حیثیت اور بیان میں مسلم نثر نگاروں نے اردو اخبارات کے ذریعے بھی اپنے پیغام کو زبان زد عام کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ ''زمیندار''، ''ہمدرد''، ''اہلال''، ''البلاغ'' نے انقلاب اور دیگر اخبارات ایسے پلیٹ فارم ثابت ہوئے جہاں مسلم نگاروں نے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی خیالات کی نمائندگی کی، اس سلسلے میں ڈاکٹر اظفر عالم لکھتے ہیں:

اس دور میں مسلمان طنز نگاروں نے کسی نہ کسی صورت اسلام سے رہنمائی ضرور کی اور جس نے اسلامی سیاسی اور سماجی ضابطوں سے انحراف کیا اس سے طنز نگاروں کو شدید وار سہنے پڑے ۳۲

مسلم طنز نگاروں میں ایک اہم نام مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا ہے۔ ان کی تحریروں اور اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اظفر عالم ظفری لکھتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ہر اس شخص، جماعت، گروہ، حکومت، مسلمان اور غیر مسلم پر طنز کی جس نے اسلامی اُصولوں کو ٹھکرایا، انہوں نے مسلمان، انگریز اور ہندو، تینوں پر طنز کی مگر اس طرح کہ پڑھنے والا تحریر سے باغی نہ ہو۔ ان کی طنز کا بنیادی حربہ موازنہ ہے۔ وہ ہر عمل اور قول کا موازنہ اسلامی احکامات سے کرتے۔ اس طرح وہ باطل پر چوٹ بھی کر دیتے اور سچ کا اظہار بھی ہو جاتا ۳۳

اردو اخبارات میں مسلم فکر کی ترجمانی اور فروغ میں عبدالماجد دریا آبادی کے بعد نصر اللہ خان عزیز کے کالم اور ان کی طرزِ تحریر زیادہ قابل ذکر ہے۔ ان کے کالم طنز اور ظرافت کا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ نصر اللہ خان عزیز کی کالم نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اظفر عالم ظفری لکھتے ہیں۔

نصر اللہ خان عزیز نے اپنی ساری زندگی اسلامی اُصولوں کی پاسداری میں صرف کی اور غیر اسلامی اعمال و افعال کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ ان کی طنزیات کے سوتے اسلامی اور غیر اسلامی، حق اور باطل

، سچ اور جھوٹ، تاریک اور روشن، دین اور کفر کے ٹکرانے سے ہی پھوٹتا ہے۔۳۴

د۔ تحریکِ خلافت اور مسلم تصورِ قومیت:۔

اسلامی فکر کے احیا اور بقا کے سلسلے میں تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کا بنیادی کردار ہے۔ تحریک عدم تعاون کا خاتمہ ہندو اور مسلمان جداگانہ راستوں کے انتخاب کا سبب بنا، مسلمان اپنے سیاسی آزادی کے ہدف کی طرف چل پڑے۔ جس کی منزل اسلام کی آزادی اور مسلمانوں کا تہذیبی احیاء تھا۔ تحریک عدم تعاون کو گاندھی نے یک طرفہ ختم کر دیا تو دوسری جانب تحریک خلافت ترکوں کے انہدام کی وجہ سے غیر موثر ثابت ہوئی۔

یہ بات کرنے کا مقصد اس اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کروانا ہے کہ ان دونوں تحریکوں کے خاتمے یا غیر موثریت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی کردار نہیں تھا بلکہ ان دونوں تحریکوں کی بالادستی اور مفالیت میں مسلمانانِ ہند کا کردار نمایاں اہمیت کا حامل رہا تھا۔ آگے چل کر یہی تحریک خلافت اور اس کے علمی احیاء کا تصور اور علم تصورِ قومیت کا تصور تحریک پاکستان کی شکل میں متشکل ہوا۔ خورشید احمد کی رائے دیکھئے۔

> مسلمان زندگی کا کوئی ایسا اجتماعی تخیل گوارا نہیں کر سکتے جو اسلام کے اجتماعی تصورات سے متصادم یا انہیں نظر انداز کر کے وجود میں آئے۔ اس احساس کو دینی فکر اور اجتماعی تحریک کی شکل دینے میں شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ دورِ جدید کے دینی ادب نے ایسی روایت کو دوبارہ قائم کیا۔ اسی بات کو اقبال نے ہندوستان میں اسلام کی مرکزیت کے حصول کا نام دیا اور یہی فکر اور یہی آرزو مطالبہ پاکستان کی صورت میں منتقل ہوئی۔۳۵

مسلم قومیت کے تصور کی تشکیل میں سرسید کے ایک اہم ساتھی مولانا الطاف حسین حالی کا نام بھی نمایاں اہمیت رکھتا ہے، انھوں نے اپنی تخلیقات میں اسلامی قومیت کو موضوع بنایا، بعد ازاں مولانا شبلی نعمانی اور علامہ اقبال نے مسلم قومیت کے فروغ میں اپنی خدمات سرانجام دیں

ح۔ الطاف حسین حالؔی اور مسلم قومیت کا تصور ناقدین کی نظر میں

مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں قومیت کا تصور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی طویل نظم مسدس حالی کو اردو کی عظیم نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نظم کا موضوع مسلمانانِ پاک ہند ہیں اور اس حالؔی نے مسلم

قومیت کی بنیاد وطن کی بجائے اسلام کو بنایا ہے۔

یہ نظم قوم کی تاریخ کو عرب میں ظہور اسلام سے بیان کرتی ہے اس کے بعد سیرتِ محمدی ﷺ اور مسلمانوں کے دنیا میں اخلاق و کردار اور ان کے بتدریج زوال پذیر ہونے اور جہالت میں گھر جانے کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ اس نظم پر مختلف ناقدین نے اپنے اپنے انداز میں اپنی مختلف آراء پیش کیں۔ جن کا اجمالی جائزہ لیا جاتا ہے۔ شیخ محمد اکرم مسدس حالی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی بیداری میں مسدس حالؔی نے بھی علی گڑھ کے قیام سے کچھ کم کام نہیں کیا۔ سرسید خود اس کتاب کی اہمیت سے واقف تھے۔ مسدس ان کے ایما پر لکھی گئی اور وہ کہتے ہیں، بے شک میں خود اس کا محرک ہوں۔ اور اس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو دنیا سے کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ میں حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔۳۶

شکوہ ہند کے متعلق ئی رائے بھی دیکھیے

> اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصور کی اساس و بنیاد کا کھوج لگانا ہو تو جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے ''شکوہِ ہند'' پہلی نظم ہے جس کو باقاعدہ اور واضح طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصور کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔۳۷

شکوہِ ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حمید احمد خان رقم طراز ہیں کہ:۔

> یہاں بھی مسدس مدو جزرِ اسلام کی طرح اسلام کے بین الاقوامی ذخیرہ فضائل یعنی عربی و عجمی، رومی و زنگی، ترکی و کردی، شرافت رنجابت کا نقشہ کھینچنے کے بعد اس نقشے کے پہلو بہ پہلو انیسویں صدی میں مسلمانانِ برعظیم کے ذمائم اخلاق کی تصویر رکھ دی گئی ہے۳۸

ہ۔ الطاف حسین حالؔی کے بعد نظریہ قومیت کا ارتقا

مولانا الطاف حسین حالی کے بعد مسلم قومیت کے تصور کے بیان میں شبلی کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا دور اصلاحی تحریک کا دور کہا جاسکتا ہے۔ جس میں انہوں نے دو مشہور مثنویاں بعنوان ''صبح امید'' اور ''مسدس قومی'' لکھیں۔ ان کی شاعری کا دوسرا دور اسلامی افکار اور رجحانات کے بیان کا عکاس ہے۔ اس دور میں ان کی مشہور نظموں میں ''مساوات اسلام، عدلِ فاروقی کا اہم واقعہ'' عدل جہانگیری''

خطاب بہ اصرار اور جزر و مد وغیرہ اہم ہیں۔ شبلی کی سیاسی نظموں میں شہر آشوب اسلام کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کے بعد علمی اور تاریخی نظموں کا سلسلہ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان سے ہوتا ہوا حفیظ جالندھری کے ''شاہنامہ اسلام'' تک پھیل گیا۔ اس ضمن میں اکبر الہٰ آبادی کی شاعری بھی اردو شاعری میں ملی و سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھنے والے اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار رقم طراز ہیں کہ:

> مخزن کے اہل قلم شیخ عبدالقادر، میر غلام بھیک نیرنگ، علامہ اقبال، ظفر علی خان وغیرہ کی طرف سے اکبر کو لسان العصر کا لقب دیا جاتا، ان کی عظمت اور قومی خدمات کا اعتراف تھا۔ لسان العصر اکبر نے حریت فکر کی جو شمع روشن کی تھی، بیسویں صدی میں اس کا اُجالا دور دور تک پھیل گیا۔ آزادی کی منزل پہ ایک شاعر کی رہنمائی تھی ۳۹

دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے پیروکار بھی دنیا بھر میں موجود ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانان کی زندگیوں میں مذہب اسلام کی تعلیمات نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کی تشکیل میں اسلام بطور مذہب بنیادی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ دراصل مذہب اسلام کے اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کی تعلیمات نے مسلمانان برصغیر کو ایک مستحکم قوم بننے میں بنیادی مدد فراہم کی ہے۔ مگر وقت کے ساتھ دنیا کے نظریات قومیت نے مسلمانانِ برصغیر کی سوچوں پر بھی ضرب کاری کا کام سرانجام دیا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ الہٰ آباد میں اسلام کے سیاسی فلسفے اور یورپ کے سیاسی فلسفے کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جو اُن کے مطابق یورپ میں مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے اور کاروبار ایک دنیاوی سلسلہ جس کا تعلق اس کی ذات سے نہیں، لیکن مذہب اسلام انسان کو اکائیت میں ڈھال کر روح اور مادہ میں تقسیم کر دینے کے مخالف ہے۔ یورپ میں مادہ اور روح کی دوئی کے تصورات کے مقابل اسلام خدا اور کائنات روح اور مادہ، کلیسا اور ریاست کو باہم مربوط انداز میں پیش کرنے کا قائل ہے، یورپ میں اسی سوچ کی وجہ سے سیاست کو اخلاق اور مذہب کے تصورات سے جدا سمجھا گیا۔

اسلام ایک ہمہ گیر اور لافانی مذہب ہے اور اس کی تعلیمات آفاقیت و ابدیت کا نظارہ پیش کرتی ہیں۔ اسلام کے تمام اُصول الہامی اساس پر استوار ہیں جن پر ایک عالمگیر سیاسی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ روئے زمین پر

برصغیر کی سرزمین مختلف النسل، مختلف الزبان اور مختلف المذاہب گروہوں پر مشتمل انسانوں کے ایک ایسے سمندر پر مشتمل ہے جو کسی ایک مشترکہ نسل کے شعور کے تحت پروان نہیں چڑھ سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان انسانوں کو ان کے متعلقہ گروہوں میں منقسم کئے بغیر مغربی جمہوریت کے تصورات اور اُصولوں کو اس علاقے میں مکمل طور پر نافذ العمل نہیں بنایا جاسکتا۔ یہی وجہ تھی جس کی بنیاد پر دوقومی نظریہ بھی وجود میں آیا اور جس کی بنیاد پر مسلمانانِ برصغیر کے لیے الگ آزاد اور خودمختار مملکت کا تصور اور مطالبہ پیش کیا گیا۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں برطانوی ہند کو ایک ریاست کے بجائے چھوٹا سا ایشیاء قرار دیا جہاں جمہوریت کا نظام اس وقت نافذ العمل نہیں کیا جاسکتا جب تک اس برصغیر کو مختلف ممالک کی شکل میں تقسیم نہیں کر دیا جاتا۔ اس ضمن میں انہوں نے قیام، پاکستان کو ہندوستان اور اسلام کی بقا کا ضامن بھی ٹھہرایا۔

اردو ادب میں ادیبوں کے علمی شعور کے تناظر میں علامہ محمد اقبال کے تصورِ قومیت کا جائزہ لیے بغیر بات ادھوری کی جاتی ہے شاعری میں اقبال اور نثر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نے امید کی جو شمع روشن کی اس نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی میں جوش و جذبہ اور حرارت کی نئی کروٹوں کو جنم دیا۔ دراصل اُس دور میں حریت پسندی کے رجحان کا عنصر غالب رہا اور ادیبوں اور شاعروں کے ہاں خالص جمالیاتی موضوعات کے برعکس دیگر قومی وعصری مسائل کو بھی موضوع قلم بنانے کی روش نے فروغ پایا۔ اقبال، محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیات کے ہاں قومی وعلمی شعور کے جذبے نے جب لفظوں کا روپ دھارا تو مسلمانانِ برصغیر کی زندگی کو ایک نئی روشنی اور امید کی دنیا نظر آئی۔ اس سلسلے میں پروفیسر فروغ احمد لکھتے ہیں۔

> 'اقبال نے حالی اور آزاد نے شبلی کے تاثر کو آگے بڑھایا۔ شبلی کی نظم کے اسلوب سے خوشہ چینی کچھ تو اقبال نے بھی ''غلامی'' اور ''صدیق اکبرؓ'' والی نظموں میں کی۔ لیکن ظفر علی خان نے بھی زیادہ کی اور اُسے بہت دور تک پھیلایا۔ اقبال نے اکبر الٰہ آبادی کی بھی کچھ تھوڑی سی تقلید کی لیکن پھر یکسو ہو گئے اور اپنے ہی رنگ کو اتنا نکھارا کہ ان کی زبان وقت کی شاعری کی زبان بن گئی'[۴۰]

علامہ محمد اقبال کے ہاں اسلام اور اس کے شعائر کو بیان کرنے کا جداگانہ اور منفرد انداز انہیں دیگر ادبا سے ممتاز بناتا ہے۔ انہوں نے بانگ درا اسلام کے واقعات کو ولولہ انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ حریت کے موضوع کو محیط کچھ نظمیں مثلاً ''فاطمہ بنت عبداللہ''، ''غلام قادر روحیلہ''، ''جنگ یرموک کا واقعہ''، ''بلادِ اسلامیہ'' حضور ''صدیق'' اور

''بلال'' وغیرہ جیسی نظمیں ایسا روح پرور نظارہ پیش کرتی ہیں کہ ہمیں اردو شاعری کا منفرد مزاج نئے آہنگ میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

یوں تو اقبال کی کل شاعری، اسلام اور مسلمانوں کے موضوعات کو محیط ہے مگر ان کے ہاں اسلامی فکر کے واضح انداز میں سامنے آنے کی نوعیت بھی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، اقبال کے ہاں اسلامی فکر کے تصور کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> انہوں نے دنیا کے لیے ایک مثالی نظام تجویز کیا۔ جس میں خالص اسلامی فکر سے تصوراتی رنگ اُبھرے۔ سب سے پہلے انسانِ کامل کی نشوونما، پھر ایک اعلیٰ اور مثالی سوسائٹی کی تشکیل، یہ اقبال کی فکر کے دو اہم اجزاء ہیں۔ یہ افلاطون کی جمہوریت سے مختلف، سرٹاس مور کی جنت العمقا سے زیادہ عملی، ابراہیم الجیلی کے روحانی الانسان الکامل سے بلند تر اور نیشے کے سادی اور تخریبی مافوق الانسان کے برعکس روحانی اور اخلاقی شخصیت کا تصور تھا۔ ۴۱

اقبال کی شاعری میں اسلامی تصور کے مطالعے کی غرض سے معلوم پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں قوموں کی حیات وموت اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کی نشاندہی اور ان کے بہترین حل کے بیان کے ساتھ ساتھ اُس جمود اور انحطاط کی نشاندہی بھی کی۔ جو مسلم دنیا پر طاری تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے تصوراتِ اسلام اور تصوراتِ دنیا کے تقابلی مطالعے کی صورت تصوف پر یونانی اور عجمی اثرات کا جائزہ لیا اور اسکے مقابلے میں اسلام کا اثبات فوری اور تعمیر حیات کا نظریہ پیش کیا۔

ر۔ اسلامی ادب کی تحریک کا تاریخی جائزہ:

اردو ادب میں اسلامی ادب اور اس کی اہمیت اور ارتقا کی بات ہو تو اسلامی ادب کی تحریک کا ذکر کئے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ اردو میں مختلف تحریکوں نے اردو ادب کے پورے کو تناور درخت میں تبدیل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ان تحریکوں میں ایک تحریک، اسلامی ادب کی تحریک بھی شامل ہے۔

مولانا مودودی نے ترجمان القرآن' کے نام سے 1932ء میں ایک رسالہ بمقام دکن (حیدرآباد) سے شروع کیا۔ اس رسالے کی اشاعت کا مقصد روایتی تبلیغ اسلام کے تصور کے برعکس دعوت اور تحریک پر مبنی تصور اسلام کو فروغ دینا تھا۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی سال انجمن ترقی پسند پلیٹ فارم سے مشہور افسانوی مجموعے انگارے کی اشاعت

بھی ہوئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت پر شدید ردعمل بھی آیا

دریں اثنا ترقی پسند کا باقاعدہ آغاز سن 1936ء میں عمل میں لایا گیا تو متوازی سطح پر اسلامی ادب کی تحریک نے بھی اپنا سفر شروع کر دیا۔ جماعت اسلامی کی بنیاد مولانا مودودیؒ نے 1941ء میں رکھی مگر قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کے ایک بانی رکن جناب نعیم صدیقی نے اسلامی ادب کی تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا۔

نعیم صدیقی کی کتاب زمینی زلزلے نے اسلامی ادب کی تحریک کے فروغ اور ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سال 1946ء میں اسی کتاب کے زیر اثر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ادیبوں کا ایک حلقہ وجود میں آیا، پروفیسر ضیاء اس جیسی قد آور اور متحرک شخصیت اس حلقے کے بانیان میں شامل تھے اور وہ ہی اس کے روحِ رواں بھی ثابت ہوئے۔

اسلامی ادب کی تحریک کا باقاعدہ آغاز کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس سے قبل اردو ادب میں اسلامی موضوعات کا احاطہ نہ کیا گیا ہو۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ اس تحریک سے پہلے اردو ادب میں انفرادی سطح پر یہ کوشش ہوتی رہی کہ اسلامی افکار اور نظریات کو پیش کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان انفرادی اور ذاتی حیثیت میں پیش کی جانے والی مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام بحیثیت مربوط نظام پیش نہ ہو سکا۔

اسلام ایک ہمہ جہت مذہب ہے جس میں زندگی کے ہر گوشے اور ہر زاویے کو مکمل راہنمائی کے ساتھ سمجھایا گیا ہے اور اسلام ایک ایسا نظام حیات مربوط انداز میں پیش کرتا ہے جو دائمی حقیقتوں اور دائمی بنیادوں پر استوار ہے۔ اسلام کی تعلیمات، انسانی زندگی کو مخصوص طرزِ حیات کے متعین راستے پر ڈھالنے کا فلسفہ پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو ادب میں اتنے مربوط نظام کو پیش کرنے کی سعی کی جاتی ہے تو اجتماعی اور انفرادی مساعی، دو قالب یک جان کا نظاہ پیش کرتی ہیں۔ یہی اسلامی تعلیمات انفرادی اور اجتماعی سطح پر جب ادب کے پلیٹ فارم سے پیش کی جاتی ہیں، تو حسن و نزاکت اور جمالیات و تخلیق کا ایک حسین گلدستہ ہمارے سامنے آ موجود ہوتا ہے عرفِ عام میں اسے اسلامی ادب کہا جاتا ہے۔

بطور مذہب اسلام ایک مکمل اور جامع نظام زندگی کا عکاس ہے۔ اور اگر اس نظام جامعیت سے اردو ادب میں روشنی کے فیض کا سلسلہ جاری و ساری رہے تو کچھ شک نہیں کہ اسلامی ادب واضح نصب العینیت کے اعلیٰ ترین اہداف کے حصول تک رسائی حاصل نہ کر سکے

ذاتیات اور فروعی معاملات سے درکنار، اسلامی ادب دراصل شعائر اسلام کا بہترین ترجمان ثابت ہوتا ہے۔ مگر چند مسلکی حدود بندیاں کہیں کہیں اس تصویر کے اصل رنگ ماند کر دیتے ہیں۔ اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ عالمگیریت اور آفاقیت کے حامل اسلامی ادب کے اصل چہرہ کی پہچان، دیدہ دل کی طلب گار اور منتظر رہتی ہے۔

اسلامی ادب کے منصب، تعامل اور افادیت اور عالمگیریت کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ترقی پسند ادب کی بہ نسبت امیر وغریب، طبقاتی معاملات کا اُلجھاؤ اور مزدور سرمایہ دار کی کشمکش کے بیانیے کے مقابل میں انسانیت اور کلیت کا درس ملتا ہے۔ اور درج بالا تمام مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے جو ابدی اور حقیقی معنوں میں صحیح نتائج کا حامل ہے۔

مگر اس درج بالا فرق کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلامی ادب محض مذہب کی ترویج کا ایک پلیٹ فارم نہیں ہے۔ اور نہ یہ دوسری تحریکوں مثلاً ترقی پسند تحریک کے مسلک سے متصادم ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک کے مقاصد اور اسلامی ادب کے مقاصد اور نصب العین میں کہیں کہیں ہم آہنگی کی فضا بھی میسر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے نصب العین کا ماخذ دنیاوی علوم ہیں جبکہ اسلامی ادب، اسلام سے اپنی روح کشید کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور اسلامی ادب کا مختصر تقابلی جائزہ درج ذیل شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے

۱۔ اسلامی ادب رہبانیت کا قائل ہرگز نہیں بلکہ زندگی کے تقاضوں اور اس میں درپیش مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے۔

۲۔ اسلامی ادب عظمتِ رفتہ کے ساتھ مستقبل میں آنے والے حالات کی پیش کش کی بھی حمایت کرتا ہے۔

۳۔ اسلامی ادب کا بنیادی موضوع انسانیت ہے اور عظمتِ انسان اس کا بنیادی موضوع ہے۔

۴۔ ترقی پسند تحریک کی طرح اسلامی ادب بھی طبقاتی نظام کی مخالفت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

۵۔ اسلامی ادب ترقی پسند ادب کی طرح ہی سرمایہ دارانہ نظام کا مخالف ہے۔

۶۔ ظالم اور مظلوم کے ترقی پسند ادب کے بیانیے کی طرح اسلامی ادب کا نصب العین اور موضوع ظالم اور مظلوم کے فرق کو بیان کرنا ہے یعنی اسلامی ادب ان دونوں گروہوں کی تقسیم کا قائل ہے۔

۷۔ ترقی پسند ادب کے نزدیک جمہور مظلوم ہے جبکہ اسلامی ادب نام نہاد جمہور کے مظلوم ہونے کے برعکس انسانیت کے مظلوم ہونے کی بات کرتا ہے۔

۸۔ اسلامی ادب حقیقتاً ایک وسیع نظامِ عمل کا داعی ہے جبکہ ترقی پسند ادب زندگی کے ایک پہلو کو موضوع بناتا ہے۔

اسلامی ادب کے ارتقا میں بعض ایسے نام بھی اردو ادب کا حصہ ہیں، جو اسلامی ادب کی تحریک کی دین ہیں۔ یعنی ذہنی و قلبی طور پر یہ ادبائے اردو اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ ہوئے اور اسی پلیٹ فارم سے اپنی پہچان بنائی۔ ان ناقدین اور ادب میں ماہر القادری، نعیم صدیقی، پروفیسر اسرار احمد خان مہاروی، پروفیسر عبدالحمید، محمود فاروقی، حمید اللہ صدیقی، پروفیسر آسی ضیائی، پروفیسر فروغ احمد اور ابن فرید وغیرہ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی انتہائی ضروری ہے کہ اسلامی ادب کی تحریک فقط چند برس ہی اپنا باقاعدہ نظام برقرار رکھ سکی۔ مگر اس تحریک کے اثرات مابعد ادب پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سنجیدہ ادب میں اسلامی ادب کا چرچا زیادہ نہیں کیا گیا مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلامی ادب کی تحریک دراصل اردو ادب میں ایک اہم اور منفرد اہمیت کی حامل تحریک رہی، جس کو اردو ادب کی تاریخ میں باقاعدہ شامل کیا جانا چاہیے۔

اسلامی ادب کے نصب العین اور مقصدیت کا ارتقا ہنوز جاری ہے۔ اگرچہ اس ادبی مسلک کو زیادہ سرعام نہیں کیا گیا مگر اب بھی اسلامی ادب کے معتقدین کی تعداد کم نہیں۔ اسلامی ادب کی ترویج میں لاہور سے ماہنامہ سیـــــارہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ ماہنامہ 1962ء میں شروع کیا گیا۔ اس رسالہ میں افکارِ مودودی کے موتی جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اس رسالے کے قلمی معاونین میں مولانا مودودی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر محمد احسن نارقی، ابوالخیر کشفی، اسم کاشمیری وغیرہ کے اسماء زیادہ قابل ذکر ہیں۔ دیگر اہل قلم بھی اپنا قلمی حصہ رسالے کی نذر کرتے رہتے ہیں۔ جن کی تفصیل اس مقالے کا موضوع نہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مولانا مودودی جیسی ہمہ جہت شخصیت کو فقط سیاسی عینک کی آنکھ سے ہی زیادہ پرکھا، دیکھا اور سمجھا گیا، حالانکہ ان کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو بھی ہیں جو ہر لحاظ سے جامعیت کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ان کی ادب حیثیت کا اعتراف، فقط اسلامی ادب کے وابستگان تک ہی محدود رہا۔ پروفیسر ہارون الرشید کی رائے دیکھیے۔

> مولانا مودودی کی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی کے ہر شعبے کا خواہ وتعلیمی ہو یا تہذیبی، فکری ہو یا علمی، اخلاقی ہو یا مذہبی، اقتصادی ہو یا سیاسی، معاشرتی ہو یا تمدنی، اسلامی نقطہ نظر سے گہرا مطالعہ کیا اور ہر معاملے اور ہر مسئلے میں اسلامی احکام اور نظریات کو نہایت وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا۔۴۲

مولانا کی نثری خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے انجم نعیم لکھتے ہیں۔

> مولانا مودودی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح شبلی کی تحریروں سے بھی اثر لیا ہے۔ ان کی نثر میں فکری قوت اور منطقی توانائی شبلی کی طرح ہے۔ لیکن مولانا شبلی کی طبیعت جلد اور بے حد متاثر ہونے والی تھی۔ ان کے محاورات اور استعارات جو فضا بناتے ہیں ان میں معتدل کیفیتیں نہیں۔ اس کے برعکس مودودی کی طبیعت میں بلا کا اعتدال وتوازن ہے۔ وہ کیسے ہی حالات کا ذکر کریں اور حالات کی جیسی بھی تصویریں کھینچیں، اعتدال وتوازن کا دامن نہیں چھوٹتا۔۴۳

اسلامی ادب کی تحریک کی کم عمری کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ قیام پاکستان کے ساتھ فطری ہم آہنگی اور ماحول کی فطری خوبصورتی نے اسلامی ادب کی ابتدائی صورت حال کیلئے بنیادی کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ 1949ء تک اسلامی ادب نے ایک اجتماعی شکل اختیار کر کے اپنی حیثیت منوالی تھی۔ مگر زمینی و سیاسی حالات کی بنا پر یہ تحریک زیادہ عرصہ اپنا وجود قائم نہ رکھ سکی۔ اور 1954ء تک اس میں غیر منظم تحریک کے اثرات نمایاں ہو کر سامنے آنا شروع ہو گئے۔

ی۔ اسلامی ادب کی تحریک کا تصور قومیت:

اسلامی ادب، چونکہ اپنے ماخذ میں قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار ہے۔ لہٰذا اسلامی ادب میں بھی تصور قومیت کو اسلام کے اُصولوں کے مطابق اہمیت دی گئی ہے۔ اسلامی ادب کی تحریک میں قومیت کا تصور سادگی اور جامعیت کا نمونہ ہے۔ تحریک ادب اسلامی تہذیب، تمدن اور زبان کے برعکس اخلاق کی تعمیر، تشکیل اور زندگی کے دیگر معاملات میں مذہب اسلام کی تعلیمات کی پیروی کو محیط ہے۔ مولانا مودودی مسئلہ قومیت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> سرسری نظر میں جو شخص نیشنل ازم کے معنیا ور اس کی حقیقت پر غور کرے گا اس سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ اسلام اور نیشنل ازم دونوں اسپرٹ اور اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام کا خطاب انسان، من الحیث انسان ہے، وہ سارے انسانوں کے لیے اعتقادی اور اخلاقی بنیاد پر عدل وتقویٰ کا ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اور سب کو اس کی طرف بلاتا ہے۔۴۴

مذہب اسلام آفاقیت کا علمبردار ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں مشاہیر نے اسلامی افکار کو اپنا رہبر و رہنما بنایا ہے۔ اردو ادب میں مومن خان مومن کو ہی دیکھ لیجئے۔ ان کی مثنوی جہادیہ پر رائے کا اظہار کرتے

ہوئے فروغ احمد، محمد حسن عسکری کی رائے کی مدد لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ہم مومن کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ اسے اسلامی شاعر مان لیا جائے لیکن اس کی ''مثنوی جہادیہ'' کو اسلامی ادب کے دائرے سے خارج کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اگر یہ مثنوی محض مذہب کے جامد افکار کی آئینہ دار ہوتی تو اس میں تحریکی جذبات کا شائبہ تک نہ ہوتا تو ہم اس کا اسلامی ادب کے سلسلہ میں نام بھی نہ لیتے ۴۵

اسلامی ادب کی تحریک کا مقصد معاشرے میں اسلامی اقدار کا فروغ تھا۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کی طرح اسلامی ادب کی تحریک کا نقطہ آغاز بھی لاہور ہی ٹھہرا۔ اس تحریک کو بنیادی طور پر دو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو ادبی اعتبار سے تجربے کی کمی اور دوسرا نظریاتی سطح سے اپنے مشن کا فروغ اور اس میں ادیبوں کی مخصوص ذہنی کیفیت، دراصل اس تحریک سے وابستہ ارباب کے جہاں اپنا نظریہ، اردو ادب میں متعارف کروانا تھا۔ وہیں ان کے سامنے ترقی پسند تحریک میں شامل ادبا کا ادبی مقام بھی تھا۔ اور انہوں نے ان حالات میں اپنا الگ تشخص اور مقام بھی بنانا تھا۔ شاہ ارشاد عثمانی کی رائے کے مطابق۔

> ادب کی اسلام کے ساتھ وابستگی تو ان لوگوں کے لیے ناگوار خاطر ہے ہی جو ادب کو کسی بھی نظریہ کسی بھی تحریک اور کسی بھی نظام زندگی کے ساتھ ذکر کرنے کے اُصولاً مخالف رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لوگ بھی ادب اور اسلام کے باہمی تعلق کو ناگواہ خاطر یا غیر ضروری پیوندکاری قرار دیتے ہیں۔ جنہوں نے باضابطہ ادب کے لیے نظریہ کو ناگزیر قرار دیا ہے اور ادب اور سماج کے باہمی رشتے پر زور دیتے رہے ہیں۔ ۴۶

اسلامی ادب کی تحریک، ترقی پسند ادب کے ردعمل کے طور پر عمل میں لائی جانے والی تحریک کے طور پر اپنی پہچان رکھتی ہے۔ مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ اس اسلامی ادب کی تحریک نے قریب ان ہی ذرائع کو بروئے کار لایا۔ جو ان سے قبل ترقی پسند تحریک نے اپنائے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے دیکھیے۔

> حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک نے ہفتہ وار جلسوں میں حلقہ ارباب ذوق کی اور تنظیمی امور میں ترقی پسند تحریک کی تقلید کی۔ ۴۷

اسلامی ادب کی تحریک کے اپنے مشن کی تکمیل میں جہاں انتظامی، داخلی اور تحریکی سطح پر مختلف اقدام اُٹھائے وہیں اس تحریک کے ملک گیر پھیلاؤ کے لیے بھی اپنے دفاتر کو ملک کے طول وعرض میں قائم کیا۔ اس سلسلے میں حلقہ

ادب اسلامی نے مختلف جگہوں پر اپنی شاخیں قائم کیں۔ جہاں ہفتہ وار اجلاس منعقد کروائے جاتے رہے۔

اردو کے چند نام ایسے ہیں جنہوں نے اسلامی ادب کی تحریک کے مقاصد اور ارتقا کو کتابی شکل میں بھی پیش کیا ہے۔ ان شخصیات میں ایک نام پروفیسر ہارون الرشید کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب اردو ادب اور اسلام میں کلاسیکی اور جدید ادب کو اسلامی نقطہ نظر سے تقابلی انداز میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر مراد احمد نے اسلامی ادب کا جائزہ میں اسلامی ادب کے امتیاز کی میلانات کو نشان زد کیا۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اسلامی ادب سے وابستہ ادیبوں کو ملک کے معروف ادبی رسائل میں ویسی جگہ نہ مل سکی جو ان کا حق تھا۔ اور اس پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس وقت کے چند معروف ادبا اور ناقدین کی طرف سے اسلامی ادب کی تحریک کی باقاعدہ مخالفت بھی کی گئی۔ ان حضرات میں فراق گورکھ پوری قراۃ العین حیدر، اخلاق احمد دہلوی، علی عباس جلال پوری، سعید احمد رفیق اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے قد آور ہم بھی شامل ہیں۔

اگر چہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں جتنی بھی تحریکات ہیں۔ ان کے حمایت کنندگان اور مخالفین بیک وقت اپنا اپنا کردار نبھاتے رہے۔ مگر اسلامی ادب کی تحریک میں مقام افسوس یہ ہے کہ اس پلیٹ فارم سے پیش کی جانے والی تخلیقات کو قومی اور ادبی سطح پر سراہا تک نہ گیا۔ اس تحریک کی تخلیقات اور ارتقا کا جائزہ لینے کے لیے اہم ترین ماخذ وہ رسائل اور جرائد ہیں۔ جن میں یہ تخلیقات شائع ہوتی رہیں پروفیسر فروغ احمد ایسے رسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اوائل 46 سے فروری 61 تک پورے پندرہ سال کے عرصہ میں شائع ہونے والے ہمارے علمی وادبی رسائل و جرائد کے تمام شماروں کے اعداد و شمار کا اگر محتاط ترین اندازہ بھی کیا جائے تو مجموعی طور پر ہمارے معیاری جرائد کے تقریباً بارہ سو شمارے تو ضرور نکلے ہوں گے اور ان میں سے اگر اہم ترین شماروں کا انتخاب بھی کیا جائے تو کم از کم ڈھائی سو رسائل و جرائد ہم ناقدین ادب بڑے اطمینان سے پیش کر سکتے ہیں۔ ۴۸

اردو ادب کے ناقدین کے سرخیل ناقد، جناب محمد حسن عسکری اس تحریک کے مخالفین میں سے تھے۔ مگر تحریک اسلامی ادب کے فروغ میں ان کے مباحث بھی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے پہلے پہل پاکستانی ادب کا نعرہ لگایا مگر بعد ازاں اسلامی ادب کے نقیب بن کر اسلامی ادب اور تہذیب سے ہمدردی کی فضا مٹانے میں اہم کردار

ادا کیا۔ انہوں نے ترقی پسند ادب کی کھلم کھلا مخالفت کی اور پاکستان کے جداگانہ تشخص کو اسلامی تہذیب سے ہم آہنگ کر دیکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ ایک جگہ محمد حسن عسکری رقم طراز ہیں۔

> ہمارے پاس تیرہ سو سال کی تاریخ موجود ہے اور یار لوگ ہمیں صلاح دیتے ہیں کہ اسے طاق نسیاں پر رکھ دو۔ اپنی قوم کے اجتماعی تجربے سے اگر ہم فائدہ نہ اُٹھا سکے تو یوں ہی اندھیرے میں بھٹکتے پھریں گے۔ ہم صرف عمر بن عبدالعزیزؒ کے جانشین نہیں ہیں۔ واحد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کے بھی جانشین ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ ہماری تاریخ ہے تو ہمیں اس تاریخ کو مجموعی طور پر قبول کرنا پڑے گا۔ اگر پاکستان کو عظیم الشان ملک بننا ہے تو ہر پاکستانی اپنی پوری تاریخ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھانا ہوگا۔۴۹

محمد حسن عسکری کے اسلامی ادب کے حق میں نعرہ لگانے سے ان کے مخالفین کی تعداد بڑھ گئی اور یہ نعرہ کافی عرصہ تک برصغیر کے ناقدین کے ہاں اختلاف انگیز مباحثے کا موضوع رہا۔ اس صورت کو ڈاکٹر آفتاب احمد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

> اردو ادب اُن کے نزدیک اس مرکزی تہذیبی روایت کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔ جسے وہ ہند اسلامی تہذیب کے نام دیتے تھے۔ اسلام سے ان کی وابستگی زیادہ گہری تھی۔ اسلام کے دینی اور فکری تصورات، اسلامی تصوف اور اس کے لوازمات، برصغیر کی سرزمین میں پیدا ہونے والے ہند اسلامی تہذیب کے نشانات، اس کا ادب انہیں بہت عزیز تھے۔ عسکری پاکستان میں بھی اسی مرکزی تہذیبی اور ادبی روایت کا فروغ چاہتے تھے۔۵۰

محمد حسن عسکری کے اسلامی ادب کی حمایت اور اسلامی ادب کی تخلیقیت کے ضمن میں شمس الرحمان فاروقی کہتے ہیں۔

> اسلامی ادب کی جو تعریف جماعت اسلامی نے متعین کی تھی اور جس پر وہ اب بھی بڑی حد تک قائم ہے۔ اس سے عسکری صاحب کو کبھی اتفاق نہیں رہا۔ جماعت اسلامی والے کہتے ہیں کہ صرف وہ ادب اسلامی ہے جس میں اسلامی اقدار کو پوری طرح پیش کیا جائے۔ اخلاقی بھی، سیاسی بھی اور جذباتی بھی اور جس میں کوئی چیز ایسی نہ ہو جو اسلامی نظام اخلاق یا ضابطے یا قوانین کی رو سے نامناسب ثابت ہو۔ وہ اس کو اسلامی ادب نہیں کہتے تھے اور ظاہر ہے کہ اسلامی ادب کی بھی وہی تعریف ان کی نظر میں مستند ہے جس پر ان کی مہر لگی ہو۔ لیکن عسکری صاحب نے کوئی جامع تعریف

خود متعین نہیں کی سوائے اس کے کہ اردو کی اصل روایت اسلامی روایت ہے ۵۱

محمد حسن عسکری کی اسلامی فکر کا تجزیہ کرتے ہوئے ثناء الحق صدیقی رقم طراز ہیں۔

عسکری صاحب ۔ دین کے معاملے میں سختی کے قائل نہیں تھے۔ غالباً ان کے نزدیک ''لا اکراہ فی الدین'' کا مفہوم یہ تھا کہ جس نے کلمہ پڑھ لیا وہ مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد وہ شعارِ اسلام پر عمل پیرا نہیں ہوتا تو اس پر سختی نہیں کرنی چاہیے۔ اب اس کا تعلق اللہ سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ مسلک صوفیہ کے قائل تھے۔ اس لیے ان میں وہ آزادی دکھائی دیتی تھی جو ''لا اکراہ فی الدین'' کی روشنی میں ہر فرد کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ تصوف کے ساتھ ساتھ وہ توحید و جودی کے نظریے کو بھی پسند کرتے تھے ۵۲

اردو ادب میں شاعری کے موضاعی مطالعہ میں یہ بات کسی سے چھپی ڈھکی نہیں کہ اس دور میں ترقی پسند تحریک کے تحت پنپنے والی شاعری میں سے کچھ حصہ اسلامی ادب کی تحریک اور مقاصد کے تحت بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ الطاف حسین حالی کی نظمیں ''برکھا رُت، نشاط امید، حب وطن اور مناظر رحم و انصاف کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی رائے یہ ہے کہ:

علی گڑھ میں سر سید احمد خان سے ملاقات کے بعد ان کی اصلاحی تحریک کے نقیب خصوصی بن کر انہوں نے ملی شاعری کا آغاز کیا۔ مدوجزر اسلام (المعروف بہ مسدس حالی) اردو کی ملی شاعری کا پہلا عظیم کارنامہ تھا۔ شبلی نعمانی اور اسماعیل میرٹھی نے بھی اس روش کی تقلید کی، اکبر الہٰ آبادی پہلے ہی اپنے اندازِ خاص میں اس قومی شاہراہ پر گامزن ہو چکے تھے ۵۳

اردو ادب کی تاریخ میں اسلامی ادب کے نمائندہ شعراء میں ماہر القادری کا نام بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری میں اسلام کے ساتھ پُر خلوص اور مکمل آہنگی کی عملی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے جناب معین الدین عقیل رقم طراز ہیں کہ:۔

ماہر القادری نے اپنی شاعری کا آغاز قدیم رنگ تغزل سے کیا، نہایت پُر اثر اور یادگار روحانی غزلیں تخلیق کیں اور اولاً شہرت اُن ہی کی بنیاد پر پائی۔ لیکن وہ اپنے عہد کی ادبی و سماجی تحریکات کے زیر اثر اپنی شاعری کو مستقلاً الگ نہ رکھ سکے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف کلاسیکی اردو شاعری کے مکمل اور حسین نمونے موجود ہیں اور انہوں نے قدیم استعاروں اور قدیم مضامین کو انوکھے اور پُر کشش انداز میں پیش کیا ہے وہیں بالخصوص ان کی منظورات فکر و حکمت، علم و دانش، قومی و ملی حمیت

اور جوش و جذبے سے آراستہ ہیں۔۵۴

اسلامی ادب کی تحریک کے اگلے سیاسی، اردو ادب کے ایک معروف نام، جناب پروفیسر فروغ احمد ہیں۔ ان کا شمار بھی اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کی شاعری میں اسلامی شعائر اور تصورات کا عکس موجزن ہے۔ آپ کی ایک مشہور نظم ''سواء السبیل'' پر رائے دیتے ہوئے نعیم صدیقی لکھتے ہیں

'پیرایہ غزل کا ہے۔ مصرعے خالص فلسفیانہ اور ٹھوس، فی الحقیقت عمرانیات و تاریخ کی اس تعبیر کو اس نظم کا سرمایہ معنی بنایا گیا ہے۔ جس کا ماخذ قرآن پاک ہے اور قرآن ہی نے اپنی حکمت تاریخ کے سلسلے میں سواء السبیل کی اصطلاح وضع کی ہے۔۵۵

اسرار احمد سہاردی کی شخصیت اردو ادب کے حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کی شاعری افسانہ نویس اور تنقید، آپ کا منفرد حوالہ ہیں۔ اسرار احمد سہاردی اسلامی ادب کی تحریک کے نمائندہ ادیب اور بانی رکن ہیں۔ اُن کی شاعری پر اقبال کے اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

اگر اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ ہر ایک ادیب، افسانہ نگار اور ناقدین کا الگ الگ جائزہ لیا جائے تو ایک لمبی فہرست مرتب ہو جائے گی۔ اس لیے چند ادباء کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہوئے دیگر تخلیق کاروں کے سرسری ذکر سے بات مکمل کی جاتی ہے۔ اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ شعراء میں جعفر بلوچ، تحسین فراقی، حفیظ الرحمان احسنؔ، طاہر شادانی اور پروفیسر آسی ضیائی کے نام زیادہ اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

افسانہ نگار، اردو نثر کی تاریخ میں نہایت اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ اسلامی ادب کی تحریک سے بھی ایسے کچھ افسانہ نگار وابستہ رہے۔ جنہوں نے اپنے منفرد وطرزِ ادا اور حسن اسلوب سے اپنی الگ پہچان بنائی۔ ان افسانہ نگاروں میں نعیم صدیقی، ماہر القادری، اسعد گیلانی، محمود فاروقی، جیلانی بی اے، قیصر قصریٰ، ابو الخطیب، آثم میرزا، فضل من اللہ، لالہ صحرائی، سید نذر زیدی اور اسرار احمد سہاروی کے اسماء زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسلامی ادب کی تحریک کے زیر اثر تخلیق پانے والے افسانے اپنے موضوع، تکنیک، اسلوب اور پیرانہ اظہار میں منفرد پہچان کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

تحریک اسلامی کے افسانہ نگاروں نے اسلامی قدروں کے امتیازی نقوش نمایاں کی نسبت ضدات کو نمایاں کیا۔ اس تحریک کا داخلی مزاج مجموعی طور پر افسانے کی تخلیق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس تحریک نے اردو افسانے میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا۵۶

اسلامی ادب کی تحریک کے زیر اثر افسانوں میں کردار نگاری پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور مجموعی طور پر اسلامی اقدار اور روایات سے ہم آہنگ ہے۔ ان افسانوں میں زبان و بیان اور اس کی لطافت کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔

ناول نگاری کے اعتبار سے بھی اسلامی ادب کی تحریک میں ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں اسلامی تاریخ کو ہی زیادہ موضوع بنایا ہے۔ اس کی ایک مثال نعیم حجازی کے ناول ہیں ان کے ناول ''محمد بن قاسم''۔ ''طارق بن زیاد''۔ ''صلاح الدین ایوبی'' فقط ناول ہی نہیں اسلامی تاریخ اور اسلام کی عظمت رفتہ کے اظہار کا عمدہ نمونہ ہیں۔ یوں بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اسلامی ادب نے قلیل وقت میں اپنی پہچان بنانے کے ساتھ ساتھ شاعری تنقید، ادارات اور افسانہ نویسی کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی بیش بہا تخلیقات بطور سرمایہ چھوڑی ہیں۔

جہاں اسلامی ادب کی تحریک نے 1948ء سے ایک اجتماعی مشکل اور تنظیمی حیثیت اختیار کی وہیں چند وجوہات کی بنا پر یہ تحریک زیادہ دیر تک اردو ادب کے پلیٹ فارم پر اپنا باقاعدہ وجود قائم نہ رکھ سکی۔ اس تحریک نے تحریکی اور دعوتی تصورات کو اپنا شکار بنایا تو اس کا ردِعمل نہ صرف دیگر روایتی مذہبی حلقوں میں دکھائی دیا بلکہ اسی وجہ سے محمد حسن عسکری جیسے عظیم ناقد اور ادیب نے بھی اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ان کا قلم اس تحریک کے خلاف بھی حرکت میں رہا۔

اصل میں اسلامی ادب کی تحریک نے اسلامی ادب کو قائم بالذّات اور مثبت انداز میں تخلیق کرنے کے بجائے اشتراکی ادب کے مدمقابل کے طور پر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی ادب کی روایت کے کمزور پڑتے ہی اسلامی ادب بھی غیر فعال ہوتا چلا گیا۔

حوالہ جات

۱۔اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز لمیٹیڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۶۳۷

۲۔القرآن

۳۔القرآن

۴۔الحدیث

۵۔گارساں دتاسی، مقالات گارساں دتاسی، ترجمہ، ڈاکٹر یوسف حسین خان، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، س ن، ص ۲۱

۶۔جیلانی کامران، قومیت کی تشکیل اور اردو زبان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۲ء، ص ۱۹

۷۔ص ۱۱۳

۸۔قائداعظم بحوالہ (تاریخ علی گڑھ)، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۹

۹۔ص ۱۳۰

۱۰۔تبسم کاشمیری، ڈاکٹر بحوالہ، خطبات سرسید، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۸

۱۱۔قائداعظم بحوالہ ((تاریخ علی گڑھ)، ص ۲۳۴

۱۲۔وحید قریشی، ڈاکٹر، اقبال اور پاکستانی قومیت، مکتبہ عالیہ، لاہور۔ص ۶۳

۱۳۔علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ برائے ایم اے اردو کوڈ نمبر ۶، یونٹ ۱۰۔۱۸، علامہ اقبال یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

۱۴۔محمود الحسن، مولانا (مترجم)، القرآن الکریم، وزارت اوقاف، سعودی عرب، ۱۹۹۳ء، ص ۸۰۶

۱۵۔ہارون الرشید، پروفیسر، اردو ادب اور اسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء۔ص ۴۱

۱۶۔سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مکتبہ خیابان ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۹۶

۱۷۔خان سعادت اکبر خان، سیارہ (ماہنامہ) کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۳

۱۸۔فروغ احمد پروفیسر، اسلامی ادب کی تحریک (مضمون)، مطبوعہ، سیارہ، لاہور ستمبر ۱۹۹۵ء، ص ۸۱

۱۹۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۴۴

۲۰۔محمد ایوب قادری، ڈاکٹر، اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع اول، ۱۹۸۸ء، ص ۳۳

۲۱۔جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ۹۹۱

۲۲۔ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۴۷۴

۲۳۔جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ۱۱۰۰

۲۴۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۸

۲۵۔آسی ضیائی، پروفیسر (مضمون)، اردو نثر کا ایک فراموش سنگ میل، مبوعہ، سیارہ، لاہور، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۵۳

۲۶۔ابن فرید، ڈاکٹر (مقالہ)، اردو نثر میں دینی خدمات، مطبوعہ، ماہنامہ سیارہ، لاہور، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۲۴

۲۷۔وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو نثر کے میلانات، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۷۸

۲۸۔عبدالمغنی، ڈاکٹر، اردو ادب میں مشرق کی بازیافت، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور، مئی۔جون ۱۹۸۵ء، ص ۶۶

۲۹۔خورشید احمد، دینی ادب (مقالہ) مشمولہ، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۸۰

۳۰۔عبدالمغنی، ڈاکٹر، اردو ادب میں مشرق کی بازیافت، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور، مئی۔جون ۱۹۸۵ء، ص ۶۶

۳۱۔ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر، اردو صحافت میں طنز و مزاح، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۸

۳۲۔ایضاً ص ۱۲۹

۳۳۔ایضاً ۱۳۱

۳۴۔خورشید احمد، دینی ادب (مقالہ) مشمولہ، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند،، ص ۳۵۶

۳۵۔محمد اکرم شیخ، موج کوثر، فیروز سنز، لاہور۔۱۹۶۳ء، ص ۱۲۴

۳۶۔غلام حسین ذولفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۶۷

۳۷۔حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغان حالی (مقدمہ)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۵

۳۸۔غلام حسین ذولفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر،، ص ۳۹

۳۹۔فروغ احمد، پروفیسر، جدید اسلامی ادب کا تاریخی پس منظر، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۹۰

۴۰۔عبداللہ، سید، ڈاکٹر، اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۹۲

۴۱۔ہارون الرشید، اردو ادب اور اسلام، ص ۳۴۲

۴۲۔انجم نعیم، ادب کی تعمیری جہت، فرینڈز پبلی کیشنز، ملتان، س ن ص ۱۹

۴۳۔ابوالاعلیٰ مودودی،تحریک آزادی ہند اور مسلمان،اسلامک پبلی کیشنز لاہور،۱۹۷۶ء،۳۴۰

۴۴۔ایضاً ۸۴

۴۵۔شاہ ارشاد عثمانی،ڈاکٹر،مقالہ،تحریک ادب اسلامی کی افتاد،ایک مختصر جائزہ،مطبوعہ ماہنامہ سیارہ،لاہور،مئی ۱۹۹۰ء،ص ۹۰

۴۶۔انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں،ص ۶۲۷

۴۷۔فروغ احمد،پروفیسر،اسلامی ادب و صحافت،علم بردار رسائل و جرائد،مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، ستمبر لاہور ۱۹۹۵ء،ص ۹۸

۴۸۔محمد حسن عسکری (مضمون)،تاریخی شعور،مشمولہ،تخلیقی عمل اور اسلوب،مرتبہ محمد سہیل عمر،نفیس اکیڈمی کراچی،۱۹۸۹ء،ص ۱۹۔۲۰

۴۹۔آفتاب احمد،ڈاکٹر(شخصی خاکہ)،محمد حسن عسکری،مشمولہ،بیاد صحبت نازک خیالاں،مکتبہ دانیال،کراچی،دسمبر ۱۹۹۸ء،ص ۲۹۳۔۲۹۴

۵۰۔فاروقی شمس الرحمٰن،ڈاکٹر،محمد حسن عسکری کے بارے میں،مطبوعہ،مکالمہ،کراچی،کتابی سلسلہ نمبر ۸،جولائی ۲۰۰۱ء،اکادمی بازیافت،ص ۲۶۵

۵۱۔فروغ احمد،پروفیسر،اسلامی ادب۔۷۰۔۱۹۷۹ء،مطبوعہ ماہنامہ سیارہ،لاہو،ستمبر ۱۹۹۵ء،ص ۱۳۱

۵۲۔غلام حسین ذوالفقار،اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر،ص ۳۶۷

۵۳۔عقیل معین الدین،ڈاکٹر(مضمون)،فروغ بادہ اقبال۔ماہر القادری،مشمولہ،پاکستانی ادب مسائل ومنظر،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۹ء،ص ۱۸۸

۵۴۔نعیم صدیقی،سواء السبیل۔ایک تاثر،مطبوعہ ماہنامہ سیارہ،لاہور،ستمبر ۱۹۹۵ء،ص ۷۶

۵۵۔انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں،انجمن ترقی اردو کراچی،۱۹۸۵ء،ص ۲۷۶

باب سوم

مولانا حالی اور ہندوستانی مسلم قومیت

ہند اسلامی تہذیب

مسلم قومیت پر نو آبادیاتی ثقافتی اثرات

حالی کا تصور مسلم قومیت

(i). مولانا حالی اور ہندوستانی مسلم قومیت

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلم قوم بہت مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی ۔ سیاسی اعتبار سے بھی مسلم قوم دیگر اقوام سے بہت پیچھے تھی ۔اُس وقت جو ہندوستان کے حکمران تھے وہ بھی مسلم قوم سے بدظن تھے ۔ دوسری قومیں ترقی اور شاہراہ پر گامزن تھیں لیکن مسلمان بے خبر سو رہے تھے ۔ اگر ہم تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر نمایاں فتح حاصل کی ہے ۔

مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنے کلام کے ذریعے مسلم قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ۔ حالی کے کلام کا کیونکر اثر نہ ہوتا وہ تو سرسید احمد خان سے براہ راست فیض یاب ہو رہے تھے ۔ حالی کی شاعری اور شخصیت میں سرسید ایک خاص مقام رکھتے ہیں ۔ حالی سرسید کے رفیقِ کار اور اُن کے خیالات کے ترجمان تھے ۔حالی نے مسلمانوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کو سدھارنے کی کوشش کی اور انُ میں مسلم قوم کی محبت کا احساس بیدار کیا۔

مولوی عبدالحق حالی کے سیاسی تصور کو یوں بیان کرتے ہیں

> مولانا الطاف حسین حالی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور قدرتی طور پر اس طبقے کی تمام خصوصیات کے حامل تھے ۔محنت ،مستقل مزاجی ، سادگی ، دل سوزی اور رواداری کی جو مثالیں اس طبقے سے ملتی ہیں وہ امرا اور روسا میں مشکل سے ملیں گی ۔ یہ خصوصیات غیر شعوری طور پر حالی کی شخصیت کا جزو بن گئیں ۔[۱]

حالی بیس سال کے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اُس وقت ظاہر بات ہے کہ حالی عمر کے اُس حصے میں تھے کہ جس میں انسان جذباتی ہوتا ہے وہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا ہے۔ حالی بھی پرانے تصورات کو ابھی تک سینے میں لگائے ہوئے تھے اُن کی غزل کا ایک شعر ہے جس سے اُن کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دیکھ اے امید کچھ ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا [۲]

یہ کیفیت صرف حالی کی نہیں ساری قوم کی تھی۔ مصرعہ ثانی محرومیوں کی پوری داستان لیے ہوئے ہے۔ قوم کے پاس کیا رہ گیا ہے۔ نہ حکومت نہ دولت نہ تجارت نہ صنعت ۔ پنپنے کے سارے آثار مٹ چکے ہیں کوئی سہارا باقی نہیں۔ بس ایک امید ہے۔ لیکن جہاں اتنے سہارے مٹے ہوئے ہیں وہاں شاعر کو شدید اندیشہ ہے کہ کہیں امید کا آخری سہارا بھی نہ جاتا رہے کیونکہ اس کے بعد تو جینے کے لیئے کوئی بہانہ نہیں۔ حالی اپنی اور ساری قوم کی مایوسیوں سے اچھی طرح واقف تھے

یہ شاعری حالی کے اس دور کی ہے جب اُن نصب العین صرف مسلمانوں کی خدمات نہ تھا۔ انہوں نے جن مشاعروں کے لیئے یہ نظمیں لکھی تھیں اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ لیکن حبِ وطن میں ضبط و اتحاد کے باوصف حالی پر ایک حد تک کھل گئے آپ نے سمجھا کہ ہندوستان میں مسلم قوم میں جتنی مایوسی پائی جاتی ہے اتنی ہندوؤں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ حالی کے ذہن میں غلامی کا کانٹا کھٹکنے لگتا ہے اور اس بری طرح کھٹکتا ہے کہ اس سخت گیری اور زبان بندی کے دور میں بھی حالی کے لبوں سے آہ نکل جاتی ہے وہ اس صورت حال کو اس طرح بیان کرتے ہیں

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ
لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی

جو نہ آتی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے

ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تو رانیوں نے گھر لوٹا

کبھی درانیوں نے زرلوٹا

کبھی نادر نے قتلِ عام

کبھی محمود نے غلام کیا

سب سے آخر میں لے گئی بازی

ایک شائستہ قوم مغرب کی[۳]

تاریخ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنے جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے شعر کے ذریعے اصلاحِ قوم کا بھیڑا اٹھایا۔ انہوں نے شعر کو دادِ سخن اور واہ واہ حاصل کرنے کے لیئے نہیں بلکہ ایک خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کے لیے استعمال کیا

قوم کا حالی پنپنا ہے محال

تو نے رو رو سب کو روایا عبث[۴]

پہلے پہل تو قوم پر متوقع اثر نہ ہوا لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ حالی کے نالے اپنا کام کرنے لگے اور حالی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا

یہی اک دن کام کر جائے گی

حالی اٹھاہلا کے محفل کو

آخر اپنا کہا کیا تونے ۵

(ii). ہند اسلامی تہذیب

اسلامی تہذیب ایک ہمہ گیر اور جامع تہذیب ہے۔ اسلامی تہذیب فطری تہذیب ہے۔ اسلامی تہذیب فقط ایک نظری تہذیب ہی نہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں رہے بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی تہذیب ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ اس دنیا میں رائج کیا جائے۔

اسلامی تہذیب انسان کو بزرگی اور شرافت کا مقام عطا کرتی ہے، اُس کے نزدیک پوری کائنات انسان کی خدمت کے لیئے سرگرم ہے انسان خلیفتہ اللہ ہے اور اللہ کی مرضی کو اس دنیا میں نافذ کرنے والا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے

> اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے اُن کو خشکی اور تری میں سواری دی اور اُن کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت دی ۶

اسلامی تہذیب ہی انسان کو صحیح درجہ دیا۔ دوسرے تمدّن یا تو انسانوں کو حیوانیت کے درجہ تک گرا دیتے ہیں یا پھر بعض انسانوں کو خدائی درجہ دے کر دوسروں کو اس کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی تہذیب کے بارے میں کہتے ہیں۔

> کلچر کے سلسلے میں اب تک ہمارے ہاں دو لفظ استعمال ہو رہے ہیں ان میں سے ایک لفظ تہذیب ہے اور دوسرا ثقافت، تہذیب کا لفظ صدیوں سے نہ صرف ہماری زبان بلکہ عربی اور فارسی میں بھی مستعمل ہے جو شائستگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار کی شائستگی شامل ہے جیسے کہ کہا جائے کہ وہ تہذیب یافتہ یا مہذب انسان ہے تو اس کے معنی یہ ہوں

گے کہ وہ اطوار اور گفتار میں شائستہ ہے ۔ لفظ تہذیب ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق ہمارے ظاہر سے ہے۔ ۷

سید سبط حسن تہذیب کی متعلق اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں

کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں ۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر واحساس کا جوہر ہوتی ہے ۔ چنانچہ زبان، آلات واوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے ، رہن سہن ، فنونِ لطیفہ علم وادب، فلسفہ وحکمت ، عقائدوافسوں ، اخلاق وعادات ، رسوم وروایات ، عشق ومحبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے متعلقہ مظاہر ہیں۔ ۸

برعظیم میں جس طرح مختلف ادوار میں مختلف حکمراں آتے رہے بعینہ مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں بھی ان علاقوں کا حصّہ رہی ہیں۔ برعظیم ہمیشہ سے کسی ایک تہذیب کے بجائے مختلف تہذیبوں کی آماج گاہ رہا ہے جب کہ یہ تہذیبیں اسی خطے میں پنپتی اور ارتقائی سفر کرتی رہیں ۔ ہر تہذیب دوسری تہذیب پر نہ صرف اثر انداز ہوتی رہی ہے بلکہ متاثر ہونے کا عمل بھی جاری رہا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں برعظیم میں مسلم تہذیب کے حوالے سے تبدیلی آنا شروع ہوئیں ۔ مسلم تہذیب کی بنیاد محمد بن قاسم نے رکھی مسلمانوں کی آمد کے بعد اس خطہ زمین پر ایک نئی تہذیب کا دور شروع ہوا۔

برعظیم میں جیسے جیسے مسلم تہذیب کا ارتقا ہوتا چلا گیا یہ اپنی نمایاں خصوصیات سے دیگر تہذیبوں سے منفرد ہوتی چلی گئی مسلم تہذیب کے احیا سے برہمنوں کی اجاداری بری طرح مجروح ہوئی اور مساوات کا نظام رائج ہو گیا۔ برعظیم کی تہذیب پر ہندومت کے اثرات صدیوں سے غالب تھے اور معاشرتی سطح پر سماج کئی طبقات میں بٹا ہوا تھا لیکن مسلم تہذیب کی آمد سے یہ طبقاتی تقسیم کافی حد تک مٹ گئی۔

مسلم تہذیب نے ہندو تہذیب پر بہت سارے اثرات ڈالے وہاں ہندو تہذیب نے بھی مسلم تہذیب کو

متاثر کیا۔ یہ ہندو مسلم تہذیب جو مختلف خصوصیات کا مرقع بن گئی ، زندگی کے ہر شعبے پر غالب آتی گئی اس بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :''

> مسلم تہذیب نے جہاں ہندومت تہذیب پر اثرات چھوڑے وہاں خود مسلم تہذیب نے کسی حد تک ہندومت تہذیب کے اثرات کو قبول کیا۹

ہندی تہذیب نے دیگر بہت سی مختلف تہذیبوں کو اپنے اندر سمویا اسی طرح مسلم تہذیب کے اثرات کو بھی پوری طرح اپنے اندر جذب کیا یہاں تک کہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے مسلم تہذیب کی روایات واقدار کو اپنی زندگی کا ایک لازمی عنصر بنالیا۔ جہاں مسلم تہذیب تھی وہاں ہندی تہذیب کے اثرات بھی گہرے تھے جو آج بھی کہیں کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ ہندی ، مسلم تہذیب کے اشتراک سے جو فطری آمیزہ وجود میں آیا وہ نہ تو بالکل اسلامی تھا اور نہ ہندی بلکہ دونوں تہذیبوں کی آمیزش سے مشترک چیزیں وجود میں آئیں اور یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔

شہزاد حسین کے بقول:

> مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں ۔۔۔ پھر گگری موری ڈھرکا کی شام ۔۔۔ کرشن کیتھا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر حرف نہ آتا تھا۔۱۰

ہندی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی بہت سی ثقافتی اقدار اور رسوم ورواج کو اپنایا۔اس طرح ہند اسلامی تہذیب کے نقوش ابھر کر سامنے آئے اور مسلمانوں کی تہذیب غالب ہونے کے باوجود مقامی تہذیب سے دامن نہ بچا سکی۔

شہزاد حسین لکھتے ہیں :

> ہندو اور مسلمانوں میں سماجی طور پر کوئی فرق نہ تھا خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساڑیاں اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے پہنتیں اودھ کے بہت پرانے خاندان کی بیگمات کے اب تک

لہنگے ہیں۔ بن بیاہی لڑکیاں دونوں ساڑی کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنتیں۔۱۱

یہ روایات واقدار پورے برعظیم کے لوگوں کی پہچان تھیں اور لاکھوں لوگ اس مخصوص تہذیب اور کلچر سے جڑے چلے آرہے تھے۔ یہ مخصوص انداز سے اپنا تہذیبی ارتقا جاری رکھے ہوئی تھی اور اس میں لحہ بہ لحہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں جو ایک مخصوص تہذیب کے پھیلاؤ اور ترقی کی غماز تھیں

(iii). مسلم قومیت پر نوآبادیاتی ثقافتی اثرات

نوآبادیات سے مراد کسی ملک کے سماجیات پر قبضے کے بعد اُن کی ثقافت اور تہذیب، تمدنی ماحول اور تاریخی شعور میں بدلاؤ کا باعث نوآبادیات کہلاتا ہے۔نوآبادیات جس سماج پر غلبہ پالیتا ہے وہاں نوآبادکار مختلف طبقوں کو جنم دیتا ہے۔نوآبادکار وہاں کے باشندوں کی زبان اور اُن کے تہذیبی عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

نوآبادیاتی تمدن نے مسلم قومیت کی تہذیبی وثقافتی فضا کو شدید متاثر کیا۔متاثر کرنے کا یہ عمل دراصل اس لئے ممکن ہوسکا کہ برصغیر پر جب برطانوی سامراج نے اپنے غلبے کو بڑھایا تو اسے متحدہ ہند کے بجائے منتشر ہندوستانی قومیت کا سامنا تھا گویا یہ فضا مسلم قومیت پر ثقافتی اثرات کے فروغ میں معاون کا کردار ادا کر رہی تھی۔

نوآبادیات ایسا نظامِ حکومت ہوتا ہے جس میں ایک عسکریت پسند ریاست کسی دوسری ریاست پر براہ راست اپنا عسکری، سیاسی، معاشی، تجارتی اور تہذیبی وثقافتی تسلط قائم کر لیتی ہے۔۱۲

فاتح قوم مفتوح پر نہ صرف اپنا حاکمانہ تسلط قائم کرتی ہے بلکہ مفتوح پر اپنی تہذیب وثقافت اور زبان وادب کی برتری کا سکہ بھی جمانا چاہتی ہے۔حکومت کو وسیع اور مستحکم کرنے کے لیے اپنے اقدار کو نافذ کرنا اُس کی پہلی کوشش ہوتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ مفتوح کی تہذیب وادب کو اپنی زبان وادب کے مقابلے میں کم تر ،غیر مہذب اور فحش گردانتی ہے ،نہ صرف زبان وثقافت بلکہ مفتوح کے رہن سہن ،رسم ورواج اور روایات کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی طنز کا نشانہ بناتی ہے۔

نوآبادیاتی تمدن نے مسلم قومیت کی تہذیبی وثقافتی فضا کو شدید متاثر کیا۔متاثر کرنے کا یہ عمل دراصل اس

لیے ممکن ہوسکا کہ برصغیر پر جب برطانوی سامراج نے اپنے غلبے کو بڑھایا تو اسے متحدہ ہند کے بجائے منتشر ہندوستانی قومیت کا سامنا تھا گویا یہ فضا مسلم قومیت پر ثقافتی اثرات کے فراغ میں معاون کا کردار ادا کر رہی تھی۔۱۳

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا سیاسی زوال دراصل اُن کے دورِ ابتلا کا آغاز تھا۔ ایک طرف مغربی استعمار انھیں تباہ کرنے کی ساعی اور دوسری طرف خود مسلمانوں نے انگریز کی پالیسوں، تمدنی بودوباش، علوم وزبان یہاں تک کہ لباس سے شدید نفرت کا اظہار کیا اور حکومت کے ساتھ مخاصمانہ رویہ اور عدمِ تعاون کی راہ اختیار کی جس کے نتیجے میں وہ اپنی اقدار اور روایات سے دور ہوتے گئے اور بلند حوصلگی، رواداری، سیاسی تدبّر اور علم کی جستجو کی بجائے تنگ نظری اور تعصب کا اس حد تک شکار ہوئے کہ اب اُن کی رفتارِ زمانہ کے ساتھ چلنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ اس نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی جبریت نے مسلم متوسط طبقے کو نچلے طبقے میں ضم ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایسے میں بقا کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ بدیسی آقاؤں کو حاکمِ وقت مانتے ہوئے نوآبادیاتی نظام کو قبول کر لیا جائے اور اسی میں زندگی کے آثار تھے۔

قاضی جاوید لکھتے ہیں:

> غیر ملکی آقاؤں سے تعلق استوار کرنے کے لیئے ضروری تھا کہ نوآبادیاتی نظام کو مکمل طور پر قبول کر لیا جائے اور اُس کے جملہ تقاضے پورے کیئے جائیں لیکن اس نظام کے اندر دونوں طبقات کے درمیان کوئی انسانی رشتہ ممکن نہیں تھا۔۔۔نوآبادیاتی صورت حال میں آقا اور غلام کے درمیان رشتے کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ کسی مقامی باشندے کو انسان تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظام مہذب ترین انسان کی شخصیت کو مسخ کر دیتا ہے اور سب سے زیادہ انسان دوست نوآبادکار بھی اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر مقامی باشندوں کو جانور تصور کرنے لگتا ہے۔۱۴

نوآبادیاتی دور جس میں ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط مکمل ہو چکا تھا اور انگریز یہاں کی آبادی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھ رہے تھے جس میں لامحالہ طور پر وہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد جو تبدیلی آئی اُس تبدیلی نے نہ صرف ہماری سیاسی تاریخ کو بدلا بلکہ

ہمارے شعور اور رویوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> نو آبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آرا پھیلاتا ہے، وہ نو آبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت، ثقافت، علم اور فنون کے متعلق موجودہ آراء کے متضاد اور اُنھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں۔ ۱۵

نو آبادیاتی پالیسی ساز اس بات سے آگاہ تھے کہ کسی قوم کی طاقت اس کی زبان اور ثقافت ہوتی ہے۔ اس لیئے انھوں نے نو آبادیاتی ممالک کے عوام کے لیئے ایسی سازشیں کاروائیاں تیار کیں جس سے ان اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت بیزاری پیدا ہوگئی۔ ان میں یہ احساس پیدا کیا گیا کہ ان کے زوال کا سبب خود ان کا اپنا نظام سیاست، مذہب تہذیب وتمدن اور ثقافتی روایات ہیں جو کہ اس جدید نظام کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ اسی مقصد کے تحت برطانیہ ہندوستان کے قدیم ثقافتی ورثے کو یا تو اپنے ہاں لے گیا یا اسے ختم کر دیا۔

ہندوستان میں نو آبادتی نظام کا قیام مرحلہ وار آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسی مناسبت سے انگریزوں کے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں خیالات تبدیل ہوتے رہے۔ ہندوستان ایک عظیم تہذیبی وثقافتی شناخت رکھتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنے ابتدائی دور میں مغل حکمرانوں کی روایات اور انتظامی اُمور کو قائم کیے رکھا یہاں تک کہ بعض انگریزوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو مکمل طور پر اختیار کر لیا۔ تاہم سیاسی اقتدار کے پھیلاؤ سے انگریزوں کے نسلی برتری اور قومی فخر کے جذبات غالب آئے اور ہندوستان میں انہوں نے نو آبادیات کاروں کے اصول پر لوٹ گھسوٹ کی انتہا کر کے اس کو پس ماندہ ملک بنا دیا۔ ۱۶

برطانوی سامراجیوں نے ہندوستان میں جو ستم ڈھایا ہے اسے دیکھتے ہوئے حالی ہندوستان کی نو آبادیاتی حکومت کو ایک مستقل عذاب اور لعنت تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی نگاہیں اس شر میں خیر کے عناصر ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ حالی جگہ جگہ ان برکتوں کا جو انگریزی دورِ حکومت میں میسر آئی تھیں بڑی فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں۔

میں ہی تھا جس نے ویرانوں کو آباد کیا
میں ہی تھا جس نے اخباروں کو آزاد کیا
حکم سے میرے ہوئی کونسلو ں کی ماموری
رائے سے میری بنیں سلطنتں جمہوری
مجلسیں سینکڑوں ملکوں میں بٹھائیں میں نے
رائیں اغلاط سے بچنے کی سمجھائیں میں نے
حکم وقانون کسی گھر میں مقید نہ رہا '
سلطنت نام سے اب قوم کی پنچایت کا ۱۷

(iv). حالی کا تصورِ مسلم قومیت

مولانا الطاف حسین حالی نے ۱۸۵۷ء میں مسلم سلطنت کا چراغ گُل ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غیر مسلم قوم نے جس طرح مسلمان قوم کو غارت گری کا نشانہ بنایا اور اسے زندگی کے ہر میدان میں بے حیثیت کر کے رکھا یہ بات حالی کے سخت تکلیف دہ تھی۔ انگریز حکومت کی جفا کاری کے ہاتھوں اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کی بے وقعتی نے اُن کے قلب میں وہ آگ روشن کر دی کہ جس کی تپش سے آج اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

انجمنِ پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرنے والے دیگر ہم عصر شعرا سے حالی کا طرز بالکل مختلف ہے۔ وطنی نظموں کی مقبولیت کے اس دور میں تنہا حالی کی نظمیں ایسی ہیں جن میں وطنیت کے ساتھ ملی احساس کو پرتو اور کرب کی وہ کیفیت ملتی ہے جو ایک باشعور اور حساس فرد کو قومی زوال اور ملی اخلاق کے انحطاط پر سراپا درد بنا دیتی ہے۔

مسدس مدوجزر اسلام حالی کا شاہکار ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ:

اسے بلاشبہ اردو کی پہلی عظیم نظم کہہ سکتے ہیں'' اردو کی اس پہلی طویل قومی نظم میں حالی نے ایک باشعور

اور باریک بین مصور کی طرح قوم کے خدوخال کو پوری جزئیات کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور اپنے خلوص اور دردمند لہجہ سے دلوں میں ایسی کسک عطا کی جس نے قومی تنزل کے حساس کو دو چند کر دیا۔ اُن کے اپنے الفاظ میں: ''اپنے بے ہنر ہاتھوں سے قوم کے لیئے ایسا آئینہ خانہ بنایا جس میں آکر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں ۱۸

بقول شیخ اکرم:

حالی کے آنسو خالص آبِ حیات کے چھینٹے تھے، دل سے نکلے ہوئے اور درد سے بھرے ہوئے۔ کون ایسا سنگدل تھا جو ان کی قدر نہ کرتا اور انھیں زمین پر پامال ہونے دیتا۔۱۹

حالی نے مسدس میں ظہورِ اسلام، اسلام کی وہ روشنی جو عرب میں پھیلی، اسلام کا عروج، اسلامی تہذیب وثقافت کی عظمت وشوکت اور اُس کے باقیات الصالحات، ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی، دوسری اقوام کی کامیابیاں اور اُن کے اسباب اور پھر مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیے تجاویز کو بڑے مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ مسدس اور اس کے بعد اکثر نظموں میں حالی نے قومی دکھڑے ہی کو موضوعِ خاص بنایا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ''مدوجزرِ اسلام'' میں اپنی قوم کو اس کے عظیم الشان ماضی کا آئینہ دکھایا ہے جہاں شوکت وعظمت بھی تھی اور اقتدار اقبال بھی تھی، دولت وثروت بھی تھی اور علم وہنر بھی۔

لیے علم وفن ان سے نصرانیوں نے
کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے
کہابڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دِل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

کیا جا کے آباد ہر ایک ملک ویراں
مہیا کیے سب کی راحت کے ساماں
خطر ناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں
انھیں کر دیا رشک صحن گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انھیں کی لگائی ہوئی ہے
یہ ہموار سڑکیں ، یہ راہیں مصفا
دو طرفہ برابر درختوں کا سایہ
نشان جابجا میل وفرسخ کے برپا
سرِ رہ کنوئیں اور سرائیں مہیا
انھیں کے ہیں سب نے یہ چرچے اتارے
اسی قافلے کے نشاں ہیں یہ سارے۲۰

ایک ماہر طبیب کی طرح حالی نہ صرف قوم کا مرض دریافت کرتے ہیں بلکہ اس کا علاج بھی بتا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے اوپر پڑنے والی ہر مشکل کا حل تمھارے پاس ہے۔ اگر ہم سے کام لو گے تو تقدیر بھی تمہارا ساتھ دے گی اور خدا بھی تمھارا حامی ناصر ہوگا

تمھی اپنی مشکل آسا ں کرو گے
تمھی درد کا اپنے درماں کرو گے
تمھی اپنی منزل کا ساماں کرو گے

کرو گے تمھی کچھ یاں کرو گے

چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے

مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے۲۱

مولانا الطاف حسین حالی بنیادی طور پر ایک فرشتہ سیرت انسان تھے۔ اُن کی ذات میں ان بہترین خوبیوں کا اظہار ہوا ہے جو انسانیت کے لیے باعث شرف ہیں۔ حالی کی تصویر میں ایک شاعر، ایک معلم، ایک نقاد، ایک مورخ، ایک سیاست دان اور یک مصلح قوم کے خدوخال نمایاں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں تحرک وارتعاش پیدا کرنے اور اس کی تہذیبی جہتوں کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور ہندوستان کے مسلمانوں میں آزادی اور جداگانہ قومیت کے تصورات کی تشکیل میں اوّلین حصہ حالی کا ہے۔ نمایاں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں تحرک وارتعاش پیدا کرنے اور اس کی تہذیبی جہتوں کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور ہندوستان کے مسلمانوں میں آزادی اور جداگانہ قومیت کے تصورات کی تشکیل میں اوّلین حصہ حالی کا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالحق،مولوی، افکارِ حالی ،انجمنِ ترقی اردو پاکستان کراچی۱۹۷۹ءص۴۵

۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی، کلیات نظمِ حالی ،،عزیزی پریس آگرہ جنوری۱۹۲۴ءص۲۳

۳۔ ایضاً ص۲۵

۴۔ ایضاً ص۲۹

۵۔ ایضاً ص۳۴

۶۔ القران

۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،پاکستانی کلچر،مشتاق بک ڈپو۔شیلڈرن روڈ۔کراچی۱۹۶۴ءص۷۰

۸۔ سید سبطِ حسن،پاکستان میں تہذیب کا ارتقا ،مکتبہ دانیال،عبداللہ روڈ،کراچی۱۹۸۹ء ص۱۳آٹھواں ایڈیشن

۹۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر،پاکستانی کلچر،مشتاق بک ڈپو۔شیلڈرن روڈ۔کراچی۱۹۶۴ءص۹۳

۱۰۔ شہزاد حسین،ہندوستان کا تمدنی ماحول،رنگ پبلیکیشنز لاہور۱۹۹۵ءص۶۷

۱۱۔ ایضاً ص۸۸

۱۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی،نوآبادیاتی شعریات اور ہم ،مشمولہ دانش (آرٹس فیکلٹی جرنل)،شمارہ۷علی گڑھ ص۱۱

۱۳۔ قاضی جاوید،برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقا،ادارہ ثقافت پاکستان ۱۲۹۔سی ماڈل ٹاؤن لاہور۔طبع اوّل ۱۹۷۷ص۱۸۱

۱۴۔ ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،نوآبادیاتی صورتحال ،مشمولہ ساختیات اور تنقید ،پورپ اکادمی اسلام

آباد۲۰۰۹ء ص۴۲

۱۵۔ کامل قریشی، ڈاکٹر، مرتب، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، اردو اکادمی دھلی ۲۰۰۶ء ص۱۱۳

۱۶۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مجموعہ نظمِ حالی، گردوت ہاؤس لاہور جون ۱۹۲۹ء ص۳۵

۱۷۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مجلس ترقی ادب لاہور جون ۲۰۰۷ء ص۱۰۶

۱۸۔ شیخ محمد اکرم، موجِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۲۰۰۳ء ص۱۲۷

۱۹۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مسدسِ حالی، مکتبہ خلیل لاہور ۲۰۰۵ء ص۱۱

۲۰۔ ایضاً ص۳۲

باب چہارم

مسدسِ حالی اور مسلم قومیت کا شعور

مسدس حالی اور عرب

مسلم تہذیب کا ابھرتا ہوا احساس

مسلم قومیت کا ارتقا

۱۔ مسدسِ حالی اور مسلم قومیت کا شعور

علی گڑھ تحریک اپنی ابتدا ہی سے اردو شعر و ادب کے قدیم طرز سے بغاوت کر کے ادب میں مقصدیت وافادیت کا علم بلند کرتی ہے اس ضمن میں جن بزرگوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان میں مولانا الطاف حسین حالی سرِ فہرست ہیں۔ حالی طبعاً نرم اور حساس طبعیت کے مالک تھے۔ وہ بیدار مغز اور قومی وملی درد رکھتے تھے۔ حالی کے بارے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> حالی خود روتے ہیں دوسروں کو رولاتے ہیں اور پھر ایسی بات کہتے ہیں کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر دلوں میں عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ماضی کے شاعر کہلاتے ہیں مگر ماضی میں کھو جانا پسند نہیں کرتے۔ ۱

مولانا الطاف حسین حالی کی ساری نظمیں اپنے تعمیری اور افادی نقطہء نظر، وسعت جامعیت اور سادہ اور شفگتہ اسلوب کے لحاظ سے اہم ہیں مگر ان میں بعض نظموں کو فکری وفنی لحاظ سے کچھ زیادہ مقبولیت ملی ہے۔ اُن کی مقبول ترین نظموں میں مسدس مدوجزرِ اسلام سرِ فہرست ہے۔ یہ نہ صرف اردو کی بلکہ شیخ محمد اکرم کے مطابق دنیا کی چند اہم ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کو حالی نے سرسید کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اردو میں کوئی دوسرا مسدس اب تک معرضِ وجود میں نہیں آسکا ہے اور یہی حالی کے تخلیقی جوہر کا آغاز ہے۔ اس مسدس کے ذریعہ مسلمانوں کے عروج وزوال کی بڑی مؤثر تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ قوم کا مرثیہ ہی نہیں ہے بلکہ قوم کے عروق مردہ میں حیاتِ نہ پیدا کرنے اور ان کو بے عملی کی دنیا سے نکال کر میدانِ عمل میں لا کھڑا کرنے کا درس دیتی ہے۔

حالی جو مسیحائے قوم بن کر آئے تھے انہوں نے اپنی اس شاہکار نظم کو اپنے خونِ جگر سے لکھا۔ یہ نظم پہلی قومی نظم ہے، اسے مسلمان قوم کے عروج کی کہانی اور زوال کا مرثیہ یا سرسید احمد خان کے الفاظ میں قوم کے حال کے آئینہ اور تاریخ کا مرثیہ کہنا چاہیے۔ اس نظم میں حالی نے مشرکہ قومی مسائل کے بجائے صرف قومِ مسلم کو موضوع بنایا ہے اور قومی ادبار کی حقیقت پسندانہ تصویریں بنائی ہیں۔ ۲

(i). مسدس حالی اور اقبال

مسدس حالی سے جس شاعر نے فکری اثر لیا اس کو دنیا علامہ محمد اقبال کے نام سے جانتی ہے۔ علامہ کی شاعری میں اور مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں بہت ساری مماثلت پائی جاتی ہے۔ علامہ محمد اقبال کی نظم ''خطاب بہ نوجوانِ اسلام'' میں جو کچھ اُنہوں نے فرمایا ہے وہی فکر مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں بیان کی ہے۔

علامہ محمد اقبال نے حالی کی مسدس کے موضوع اور مضامین کو اپنی بصیرت کے اضافے کے ساتھ پیش کیا۔ حالی کی مسدس کے اثرات اقبال کے ہاں بعض جگہ بہت واضع نظر آتے ہیں۔ علامہ کی نظم ''خطاب بہ نوجوانانِ اسلام''۲

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا۳

ان دونوں اشعار کا مضمون حالی کے ہاں بھی موجود ہے۔

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا
ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا
وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف قدریاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں
حکومت نے تم کیا گر کنارا

تو اس میں نہ تھا کچھ تمھارا اجارا

زمانے کی گردش سے ہے کس کو چارا

کبھی یاں سکندر کبھی یاں ہے دارا

نہیں بادشاہی کچھ آخر خدائی

جو ہے اپنی تو کل ہے پرائی ۴

مولانا حالی نے مدوجزرِ اسلام میں جس موضوع پر فکرِ سخن کیا ہے، یہی اقبال کا موضوعِ سخن تھا۔ اقبال نے اس موضوع میں نئی جہات کو اضافہ کیا اور شعروادب میں ایک نیا جہانِ معنی دریافت کیا۔ علامہ اقبال کے ہاں اسلام کا عروج بھی نظر آتا ہے اور مسلمانوں کا زوال بھی اور نئی زندگی کا پیام بھی۔

مولانا حالی اردو شاعری کی تاریخ میں وہ پہلے زندہ شاعر ہیں جنہوں نے تاریخ سے شعری تحریک حاصل کی اور تاریخ کو شعر بنانے کی کوشش کی۔ اسی لیئے ہم انھیں اردو میں قومی شاعری کا بنیادگزار مانتے ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی مسلم تہذیب اور مسلم تاریخ کو موضوعِ شعر بنایا اور حالی سے آغاز ہونے والی قومی شاعری کا سفر اقبال کے ہاں بلندیوں تک جا پہنچا۔

مسدس حالی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور مغلوبیت، دوسری اقوام کی کامیابیاں اور ان کے اسباب اور پھر مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیئے تجاویز کو بڑے مربوط انداز میں پیش کیا ہے اسی طرح اقبال نے اپنی نظم شکوہ اور جوابِ شکوہ میں یہ چیزیں بیان کی ہیں۔ علامہ اقبال اسلامی اصول کی روشنی میں قومیت کی تشکیل اور اتحاد کے قائل ہیں جبکہ حالی مسلمانوں میں آزادی اور جداگانہ قومیت کے قائل ہیں۔

بقولِ حالی:

اِنھیں کے بزرگ ایک دن حکمران تھے

اِنھیں کے پرستار پیروجواں تھے
یہی مامن عاجزوناتواں تھے
یہی مرجع ویلم واصفہاں تھے
یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی
اِنھیں کے گھروں میں تھی صاحب قرآنی ۵

بقولِ اقبال:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرومنزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی،یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۶

مسدس حالی کے ذریعے قوم کی اصلاح کے لیئے حالی نے جو کام کیاوہ اردو زبان میں کسی اور شاعر سے نہیں ہوا۔ اس دعوے کی تردید میں اقبال کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔مگر اقبال بھی حالی کا پیدا کردہ شاعر تھا۔ حالی نے اردو میں شاعری کے ذریعے اصلاحِ قوم کی راہ کھول دی۔اقبال اسی راستے کا ایک جلیل القدر رہرو ہے۔

ب۔ مسدسِ حالی اور عرب تہذیب

مولانا الطاف حسین حالی نے مسلمانانِ ہند کی ابتر سیاسی وسماجی حالت پر مسدس تخلیق کرتے ہوئے عرب تہذیب کا نقشہ بھی کھینچا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اہلِ عرب اسلام سے قبل طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا تھے مگر اسلام لانے کے بعد ہی خونریز قبائل آپس میں شیر وشکر ہوگئے اور ترقی کی معراج پر جا پہنچے۔

عرب کی تہذیبی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں کرتے ہوئے پہلے وہ صحرائے عرب کی جغرافیائی حالت بیان کرتے ہیں:۶

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا
نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا۷

صحرائے عرب باقی دنیا سے الگ تھلگ ایک جزیرہ نما تھا اور جس نے نہ ترقی کی تھی اور نہ ہی دوسری تہذیبوں کے اثرات اس پر پڑے تھے۔ یہاں کی مٹی، موسم اور آب وہوا ہی ایسی سخت تھی کہ کسی قابل جوہر کا پیدا ہونا ہی ممکن نہ تھا۔ زرخیز زمین، جنگلات اور پانی کم تھے۔

خطے کی جغرافیائی حالات وہاں کے رہنے والوں کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوئے ہیں اور ان کی تہذیبی زندگی کو دوسرے خطوں سے الگ شناخت دیتے ہیں۔ صحرائے عرب کی سنگلاخ زمین اور سخت موسم نے لوگوں میں جسمانی اور ذہنی طور پر سختی کا عنصر پیدا کی دیا تھا۔ ان کی ذہنی شائستگی کا فقدان تھا۔

جغرافیائی حالات کے بیان کے بعد مولانا الطاف حسین اگلے بندوں میں وہاں کی مذہبی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ چونکہ وہاں عیسائیت کے علاوہ آتش پرست، ستارہ پرست اور بتوں کے پجاری آباد تھے۔ ۷

کہیں آگ پُجتی تھی واں بے محابا
کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا
بتوں کا عمل سو بسو جابجا تھا
کرشموں کا راہب کے تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی ۸

درج بالا بند میں وہ واضح کرتے ہیں کہ اہلِ عرب خدائے واحد پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ سوائے عیسائیت کے باقی سب فرقے مختلف مظاہر اور بتوں عبادت کرتے تھے۔ عام لوگ راہبوں کے زیرِ اثر تھے جو کچھ اُن کے راہب اُن کو کہتے اسی پر عمل کرنا اُن کا مذہبی فریضہ تھا۔ اسی طرح کاہنوں کی جاگیرداری نے بھی لوگوں کو اپنے اثر میں لے رکھا تھا۔ کاہن مستقبل کے حالات بتانے کا ڈھونک رچا کر لوگوں سے رقم بٹورتے تھے۔

مختلف عقائد کے یہ لوگ تہذیبی طور پر منتشر تھے۔ نہ کوئی ایک دین تھا اور نہ ایک حکومت تھی توہمات کے باعث معاشرے میں بے چینی تھی۔ معاشرہ ناانصافی اور بدامنی کا شکار تھا۔ قتل وغارت گری کا دور دورہ تھا۔ دو افراد کے مابین لڑائی پھیل کر دو قبائل کی لڑائی کی صورت اختیار کر لیتی اور یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہتا تھا۔

ہزاروں لوگ ان باہمی لڑائیوں میں قتل ہو جاتے تھے۔ ایسی ہی لڑائیوں میں دو عرب قبائل بکر اور تغلب کی لڑائی مشہور ہے جو کم وبیش نصف صدی تک جاری رہی۔ یہ لڑائیاں کسی بڑے قومی مقصد کے لیے نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ معمولی سی بات سے شروع ہو کر بے مقصد سالوں پر محیط رہتی تھیں۔ ایسے جھگڑے چراہ گاہ میں مویشی چرانے، جانوروں کو پانی پلانے اور گھوڑا آگے دوڑانے جیسی باتوں سے شروع ہوتی تھیں۔ حالی نے ایسی لڑائیوں کی طرف یوں

اشارہ کیا ہے۔

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اِک آگ ہر سُو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک ودولت کا تھا وہ
کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ
کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار اُن کی
یونہی چلتی رہتی تھی تلواراُن کی[۹]

قبل اسلام عربوں کی سماجی زندگی میں شراب کا رواج عام تھا۔وہ شراب نوشی کباب ،خوری اور عیش وعشرت کے دلداہ تھے۔لڑکیوں کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھتے تھے ۔ حالی نے مسدس میں اُن کی اس کمزوری کی خوب نمایاں کیا ہے اور علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ میں اس پہلو پر تفصیل سے لکھا ہے اور ابوحمزہ کی مثال پیش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

ابوحمزہ ایک رئیس تھا۔اُس کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تو اُس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا۔اُس

پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی۔

مالا بی حمزہ لا یاتینا
یبعیت فی بیت التی تلینا
غضبان الاتلد البنینا تا اللہ ماذاک بایدینا
ونحن کالزرع لزارعینا ننبت ماقد زرعوہ فینا

ترجمہ: ابو حمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا اور ہمسایہ کے گھر ہی رات بسر کرتا ہے
،اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں ہم بطورِ کھیت کے
ہیں ہم میں جو بویا جائے گا وہی اُگے گا۔۱۰

مولانا الطاف حسین حالی نے عرب کی ایک اور جاہلانہ سوچ کو اپنے مسدس میں یوں نمایاں کیا ہے:

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی ۱۱

بچیوں کے علاوہ عورتوں پر بھی طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ معاشرے میں عورتوں کا مقام بہت کم تر تھا۔ انہیں وراثت کے حق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ قبائل کی باہمی لڑائیوں میں اکثر عورتیں میدانِ جنگ میں

ہاتھ آ جاتی تھیں تو بغیر نکاح کے اُن کو تصرف میں لایا جاتا تھا اور اگر صلح ہو جاتی تو اُن عورتوں کو واپس کر دیا جاتا تھا اور خاوند دوبارہ اُن کو اپنے گھر میں رکھ لیتے تھے۔

آزاد صحرائی زندگی نے عربوں کو ہر طرح سے بنا رکھا تھا۔ سماجی قاعدے اور قوانین نہ ہونے کے برابر تھے ۔ عام لوگ خودسر اور سرکش تھے۔ دلوں سے رحم اور ہمدردی کے جذبات نکل چکے تھے۔ زندہ جانور کو درخت سے باندھ کر اُس پر تیر اندازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ جنگ کے دوران حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے جاتے تھے۔ مقتول کے کان اور ناک کاٹ لی جاتی تھی۔ شجاعت اور بہادری کو غلط مفہوم دے دیا گیا تھا۔ دوسروں کی مال و دولت اور مویشوں پر زبردستی قبضہ جما لیا جاتا تھا۔ چوری اور ڈاکہ زنی کو بھی بہادری خیال کر کے اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ اس لوٹ مار کو الطاف حسین حالی نے یوں نمایاں کیا ہے:

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے ۱۲

معاشرے میں شراب و نوشی عام تھی ۔ گھروں میں شراب و کباب کی محفلیں سجائی جاتی تھیں ۔ ان محفلوں میں حسین عورتوں کو رقص ہوتا تھا اور اونٹوں کی شرطیں بھی لگائی جاتی تھیں ۔ شرط میں ہارے ہوئے اونٹ کو ذبح کر کے بھون کر کھایا جاتا تھا۔ اس دور کے معاشرے میں ایسی عیش و عشرت کا عکس قدیم عرب شاعری میں ملتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے عرب معاشرے میں جوا اور شراب نوشی کے عام رواج کا نقشہ اپنی مسدس میں یوں پیش کیا ہے:

جُوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی
شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا، غفلت تھی ، دیوانگی تھی
غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی
بہت اس طرح ان کی گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکوں پر تھیں بدیاں[۱۳]

صحرائے عرب کی وسعتوں میں آزاد زندگی اور بے فکری نے ان کو ہر طرح علوم وفنون سے غافل کر رکھا تھا۔ تعلیم کا رجحان بہت کم تھا۔ اعلیٰ علوم وفنون کا فقدان تھا۔ فنون میں فنِ شاعری اور جنگی فنون پر زیادہ توجہ تھی۔ اس عہد میں مصر اور یونان میں علوم وفنون نے جو ترقی کی تھی صحرائے عرب والوں نے ان سے بھی کوئی استفادہ نہیں کیا تھا۔ دراصل ہر طرح کے معاشرتی قوانین نے آزاد معاشرے میں طاقت اور شمشیر زنی ہی کو بڑی خوبی سمجھا جاتا تھا۔ اس کو ترقی تصور کیا جاتا تھا۔ علوم وفنون کے حصول کی کمزور تر حالت کو الطاف حسین حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی
نہ یونان کے علم وفن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبعِ بشر تھی
خدا کی زمیں بن جُتی سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا[۱۴]

قدیم عرب معاشرہ طرح طرح کے توہمات کا شکار تھا۔ معاشرہ کاہنوں کے زیرِ اثر تھا۔ یہ کاہن غیب کی پیش گوئیاں کرتے اور لوگوں سے رقم بٹورتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے ''سیرت النبی ﷺ'' میں کاہنوں کے متعلق

معلومات دیتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے جب لوگ ان سے غیب کی بات پوچھتے یا وہ خود آہندہ کے متعلق پیش گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کفیت اپنے اوپر طاری کرتے۔ مرد بھی کاہن ہوتے اور بعض عورتیں بھی ہوتیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں۔ یہ مصیبتوں اور بلاؤں کو دور کرنے کے لیے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے۔ یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقم اور نذرانے وصول کرتے تھے۔۱۵

اسلام سے قبل عرب میں بت پرستی عام تھی۔ مختلف قبائل کے مختلف بت تھے۔ مثلاً قبیلہ ثقیف کا بت لات تھا۔ اوس وخزرج قبائل کے بت کا نام منات تھا۔ قبیلہ قریش اور بنوشیبان کے بت کا نام عزیٰ تھا۔ ان قبائل نے اپنے اپنے بت خانہ کعبہ میں بھی نصب کر دیے تھے جن کی تعداد تین سو ساٹھ (۳۶۰) تک جا پہنچی تھی۔ حالی نے عربوں کی بت پرستی کو اپنی مسدس میں یوں بیان کیا ہے:

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا
کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نامِ حق کا نہ تھا کوئی جویا
قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا
کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عُزّا پہ وہ نائلہ پر فدا تھا

اسی طرح گھر گھر نیا اِک خدا تھا

نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور

اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر ۱۶

قدیم عربوں کے عقائد، نظریہ حیات، رسم ورواج، غرض مذہبی اور تہذیبی زندگی کے ہر پہلو کو الطاف حسین حالی نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ اپنی مسدس میں نمایاں کیا ہے۔ اس مسدس کے چند بندوں میں قدیم عرب کی تہذیبی زندگی کے سبھی رنگ جھلکتے ہیں۔

ج۔ مسلم تہذیب کا ابھرتا ہوا احساس

برِعظیم ہزاروں سالہ پرانی تہذیب وثقافت کی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس خطہء زمین میں جس طرح مختلف ادوار میں مختلف حکمران آتے رہے بعینہٖ مختلف تہذیبیں اور ثقافتیں بھی ان علاقوں کا حصہ رہی ہیں۔ برِعظیم ہمیشہ سے کسی ایک تہذیب کے بجائے مختلف تہذیبوں کی آماج گاہ رہا ہے یہاں کی تہذیب ایک ہی وقت میں ہندو تہذیب، مسلم تہذیب، مغربی تہذیب، بدھ مت زرتشت، جین مت، انگریزی اینگلو انڈین اور کئی دیگر تہذیبوں کے میلانات اور رجحانات کی عکاس ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں برِعظیم میں مسلم تہذیب کے حوالے سے تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ مسلمان فاتحین اور تاجروں کی رفتہ رفتہ آمد کے بعد ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے دیبل سے ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا اس طرح علاقے میں اسلام کی آمد ہوئی۔ اسلامی تہذیب کے اثرات دیگر مذاہب اور ان کے ماننے والوں نے بہت حد تک قبول کیے جس سے ایثار، قربانی اور رواداری کے جذبات اور احساسات کو تقویت حاصل ہوئی۔ مسلم تہذیب کے احیا سے صدیوں سے رائج برِعظیم میں حاکمیت کا تصور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔

برِعظیم میں جیسے جیسے مسلم تہذیب کا ارتقا ہوتا چلا گیا ہ اپنی نمایاں خصوصیات سے دیگر تہذیبوں سے منفرد اور ممتاز ہوتی چلی گئی۔ مسلم تہذیب کے احیا سے برہمنوں کی اجارہ داری بری طرح مجروح ہوئی اور مساوات کا نظام رائج ہو گیا۔ ۱۷

(i). سرسید احمد خان اور مسلم تہذیب

ہندوستان میں سرسید احمد خان وہ پہلے ادیب تھے جنہوں نے ادب کو لوگوں میں شعور پیدا کرنے، یکجا ہونے کے لیے مؤثر آلے کے طور پر استعمال کیا۔ سرسید کی اصلاحی تحریک دراصل اہل ہند کی تہذیب وثقافت کے احیاء کی تحریک تھی۔ اس تحریک میں تمام باشندوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے خصوصاً احیاء اور ذہنی بیداری کا پیغام تھا۔ اس سے پہلے مسلمان علمی وادبی اور تہذیبی حوالے سے اپنے مسائل کے ادراک سے کوسوں دور تھے۔ سرسید احمد خان جانتے

تھے کہ جب تک مسلمان اپنی تہذیبی وثقافتی حوالے سے ترقی نہیں کریں گے تو وہ دوسری اقوام سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ سرسید کے جن رفقا نے مسلم تہذیب کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی اُن میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام بھی آتا ہے ۔حالی نے ادب کے ذریعے مسلمانوں کے اندر اپنی تہذیبی شناخت کو پہچاننے کے لیے بڑی موثر کوشش کی ۔ کیونکہ حالی کے دور کے اندر مسلمان اپنی تہذیبی شناخت کو بھول گے تھے۔

(ii). حالی اور اسلامی تہذیب

مولانا الطاف حسین حالی کا عرصہ ہماری تہذیبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ حالی نے اس تہذیب ومعاشرت میں آنکھ کھولی تھی جو قدیم جاگیردای نظام کی پیداوار تھی۔ قدرتی طور پر انھیں اسی نظامِ حکومت سے لگاؤ ہو چاہیے لیکن انہوں نے عام مسلمانوں کی طرح جذباتی رو میں بہنا پسند نہ کیا۔

حالی ایک طرف مغربی تہذیب کو دیکھتے ہیں جو دنیاوی طریقوں کی علم بردار ہے دوسری طرف مسلم تہذیب ہے جو جاگیری نظام کے خلاف اور عدل ومساوات کا درس دیتی ہے ۔ حالی کے نزدیک مسلم تہذیب ایک عالم گیر تہذیب ہے اور یہ تہذیب اپنی خصوصیات کی بنا پر دوسری تمام تہذیبوں سے اچھی تہذیب ہے ۔ مسدس میں وہ اُس زمانے کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں جب مسلمانوں نے پہلے پہل ترقی کے میدان میں قدم اٹھایا۔ اس وقت ان تمام تہذیبوں کا شیرازہ بکھیر دیا اور مسلم تہذیب غالب آئی

(iii). اقبال اور مسلم تہذیب

علامہ محمد اقبال نے اپنے شعری اور نثری آثار میں اپنے تصوراتِ تہذیب وثقافت کی نہایت خوبی سے وضاحت کی ہے ۔ اقبال کے نزدیک غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دے کر نبی اکرم ﷺ نے ایک اعلیٰ تمدن کی بنیاد رکھی ،جس سے پیدا ہونے والے مثبت نتائج تمام دنیا محسوس کر رہی ہے۔ اقبال کے تصورِ تہذیب کا مرکزی نقطہ مساوی حقوقِ انسانی ہیں ۔ وہ اس حدیث نبوی ﷺ سے جو ''الخلوق عیال اللہ'' کے حامل لفظوں کی صورت میں موجود ہے، بخوبی آگاہ ہیں۔ جاوید نامہ میں محکمات عالم قرآنی کے زیرِعنوان حکمتِ قرآن اور تخلیقِ آدم کی معنویت کو نمایاں کرتے ہوئے انہوں نے ''احترامِ آدمیت'' کو اصل تہذیب قرار دیا ہے۔

بر تر از گردوں مقام آدم است

اصل تہذیب احترام آدم است

اقبال نے متعدد مقامات پر مسلم تہذیب کو ایک برگزیدہ، برتر اور تاریخ ساز تہذیب کے طور پر پیش کیا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ یہی تہذیب اپنے اندر ایسے عناصر رکھتی ہے جس سے تعمیر عالم انسانی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ نکسن کے نام اپنے ایک خط میں اپنے مغربی معترضین کے ضمن میں مسلم تہذیب کی برتری کا بہ دلائل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یورپ اسلام سے بعض عمدہ باتیں سیکھ سکتا ہے۔

اقبال نے اپنی معاصر یورپی تہذیب کو کہیں ''تہذیب نو'' کہیں ''تہذیب حاضر'' کہیں ''تہذیب جدید'' کہیں ''تہذیب مغرب'' اور کہیں صرف ''تہذیب'' کہہ کر اس کے منفی اور انسان کش عناصر کی نشاندہی کی۔ یہ تہذیب بقولِ اقبال روشن چہرے والی ہے مگر چنگیز کا باطن رکھتی ہے جو ظاہر کو چمکاتی ہے، باطن کو ہلاک کرتی ہے۔ اس کا مقصود آدمی دری ہے اور یہ ایک لادین تہذیب ہے۔

اقبال نے مسلم تہذیب کو ایک زندہ، روشن اور انسانیت نواز تہذیب کے طور پر بڑے اعتماد کے سے پیش کیا ہے جس کی برکات وثمرات سے پوری نوعِ انسانی فیض یاب ہوئی ہے اور آئندہ بھی ہوسکتی ہے۔

د۔ مسلم قومیت کا ارتقا

قومی تشخص کی بیداری میں حالات کے ساتھ ساتھ سرسید اور علی گڑھ تحریک کا بڑا حصّہ ہے۔ ابتدا میں سرسید احمد خان کا عقیدہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مشترک ہیں اس لیئے ان کی اصلاحی کوششیں بلا امتیاز مذہب عمل پیرا رہیں۔ وہ ایک بڑے عرصے تک ہندو مسلم اقوام کو دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تعبیر کرتے رہے لیکن ہندوؤں کی مخلصانہ رفاقت میسر نہ ہونے کی بعد وہ ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو کر صرف مسلمانوں کی فکری ومعاشی اصلاح اور تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دی بالآخر ان کی یہ کوششیں قومی وملی بیداری میں معاون ومددگار ثابت ہوئیں۔ مولوی عبدالحق سرسید کی ان کوششوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

سرسید نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا اس سے پہلے قوم سے مراد سیّد، مغل، پٹھان تھی سرسید نے اسے نیشن کے ہم معنی بنایا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔ ۱۸

سرسید تحریک کے حلقہ اثر سے باہر بھی اس قسم کی کوششیں نظر آتی ہیں مثلاً انجمن حمایت اسلام کی بنیاد ستمبر ۱۸۸۴ء میں قاضی حمید الدین کے ہاتھوں پڑی جس کا مقصد مذہبی تعلیم اور اسلام کے خلاف پروپگنڈے کا رد کرنا تھا، سندھ میں حسن علی آفندی کی کوششوں سے ۱۸۸۵ء میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے سلسلے میں سندھ مدرستہ العلوم کراچی قائم ہوا، ۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری نے جدید علوم کی تعلیم کو اردو کے ذریعے پھیلانے کی تحریک چلائی ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد دکن میں یہ یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کے نام سے قائم ہوئی۔

یہ اور اس قسم کی دوسری کوششوں کا ظہور اس بات کی علامت تھی کہ اب مسلمانوں کو اپنی الگ قومیت کا احساس ہو گیا تھا اور اس کے ارتقا کے لیئے باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی گئی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور، تاریخ ادب اردو۔ انجمنِ ترقی اردو کراچی ۲۰۰۰ء ص ۱۰۶

۲۔ صالحہ عابدہ حسین، یادگارِ حالی، بک ٹاک لاہور ۲۰۰۷ء ص ۱۵۴

۳۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۹۰ء ص ۲۷

۴۔ حالی، الطاف حسین، مسدس حالی، مکتبہ خلیل لاہور ۲۰۰۵ء ص ۴۹

۵۔ ایضاً ص ۴۸

۶۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۹۰ء ص ۱۹۵

۷۔ حالی، الطاف حسین، مسدسِ حالی، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۹ء ص ۱۹

۸۔ ایضاً ص ۱۹

۹۔ ایضاً ص ۲۰۔۲۱

۱۰۔ شبلی نعمانی، علامہ، سیرت النبی ﷺ جلد دوم، شمع بک ایجنسی لاہور ص ۴۷۵ سن

۱۱۔ حالی، الطاف حسین، مسدسِ حالی، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۹ء ص ۲۱

۱۲۔ ایضاً ص ۲۰

۱۳۔ ایضاً ص ۲۱

۱۴۔ ایضاً ص ۱۹

۱۵۔ شبلی نعمانی، علامہ، سیرت النبی ﷺ جلد دوم، شمع بک ایجنسی لاہور ص ۴۶۳ سن

۱۶۔ حالی، الطاف حسین، مسدسِ حالی، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۹ء ص ۲۱

۱۷۔ سید سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ کراچی ۱۹۸۹ء ۶۹

۱۸۔ مولوی عبدالحق، افکارِ سرسید، انجمن ترقی اردو پاکستان، انجمن پریس نشتر روڈ، کراچی ۱۹۷۹ء ص ۵۴

باب پنجم

مولانا الطاف حسین حالی کی نظموں میں مسلم قومیت کا شعور

موضوعاتی نظموں میں مسلم قومیت کا شعور

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی کی نظموں میں مسلم قومیت کا شعور

مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۵۷ء کی جنگ کے عینی شاہد تھے انہوں نے اپنی آنکھوں سے مغلیہ سلطنت کا چراغ گُل ہوتے دیکھا تھا۔ غیر ملکی فاتحین نے جس طرح مسلمان قوم کو دار و گیری اور غارت گیری کا نشانہ بنایا اور اسے زندگی کے ہر میدان میں بے حیثیت کر کے رکھ دیا، اس سے وہ جذباتی طور پر متاثر ہوئے۔ حالی کے ان جذبات کا اظہار ''تذکرہ دہلی مرحوم'' میں بڑے دل گداز انداز میں ہوا ہے۔

۱۸۵۷ء کے واقعات نے حالی کی شخصیت کو شعوری طور پر ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا، جہاں قوم کی حالت زار کے علاوہ اور کوئی چیز سمجھائی نہیں دیتی تھی چنانچہ حالی کی تمام تر علمی، ادبی اور فکری مساعی کا مرکز قوم ہی ٹھہری۔

حالی نے جس تہذیب و معاشرت میں آنکھ کھولی تھی وہ قدیم جاگیرداری نظام کی پیداوار تھی۔ قدرتی طور پر اُنھیں اِسی نظامِ حکومت سے لگاؤ ہونا چاہیے تھا لیکن اُنہوں نے عام مسلمانوں کی طرح جذباتی رو میں بہنا پسند نہیں کیا۔ اِس جذباتی کشمکش سے نکلنے کے لئے عقل و انصاف سے کام لیا۔ حالی نے ایشائی طرزِ حکومت کے بارے میں جو ہندوستان میں صدیوں سے رائج تھی اپنی نظموں میں بعض اشارے کیئے ہیں مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں

وہ گئے دن جب کہ تھے مختار و مطلق حکمران
قسموں میں قبضہِ قدرت میں تھی اُن کے عنان
ہاتھ میں غسال کے مُردہ ہو بے بس جس طرح
تھے جہاں بانوں کے ہاتھوں میں ہی اہلِ جہاں
تھا رعیت کا کوئی ہمدرد تو تھا بادشاہ
اور مصلح تھا کوئی اُس کا تو تھا خود حکمراں
تھی نہ اہلِ مُلک کو قومی مقاصد سے غرض

تھا نہ قومیت کا قوموں میں کہاں باقی نشان
خواہشیں سب کی جدا اغراض تھیں سب کی الگ
اپنے اپنے راگ تھے اور اپنی اپنی ڈفلیاں
قوم اپنی حد سے آگے کوئی بڑھ سکتی نہ تھی
پیش قدمی سے رکے کب کے کھڑے تھے کارواں(۱)

ان اشعار میں مولانا الطاف حسین حالی مجموعی طور پر ہندوستانی قومیت کا احساس دلاتے ہیں۔ حالی دراصل سماجی اصلاحات کے ذریعے مسلمانوں میں ایک متوسط طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی طبقے میں اُنہیں وہ صلاحیت نظر آتی تھی جو قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے نکال کر کنارے تک پہنچا سکتی تھی۔ یوں تو مسلمانوں میں صاحبانِ ثروت بھی تھے اور علمائے مذہب بھی، لیکن حالی کو اُن سے کوئی خاص توقع نہ تھی کیونکہ یہ اپنے حال میں مست تھے اور وہ اپنے خول میں بند۔ نئے حالات اور نئے تقاضوں سے نہ اُنہیں واقفیت نہ اُنہیں دلچسپی۔

قوم کو اپنے تنزل سے اُبھرنے کی اُمید
اہلِ علم واہلِ دولت سے بہت کچھ تھی مگر
اہلِ دولت کا ہے اِس عالم سے اک عالم جدا
عالم بالا سے بھی ہے جو کئی منزل ادھر
اب رہے علم سو اتنا سوفتا ان کو کہاں
دین کا پھر کون ہے؟ دنیا میں وہ اُلجھیں اگر(۲)

مولانا الطاف حسین حالی ہندوستانی مسلمانوں میں کم و بیش ویسا متوسط طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جیسا کہ انگلستان کے صنعتی عہد میں پیدا ہوا تھا اور جس نے تاریخی ارتقا کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ میں اقتدار حاصل کر لیا تھا

اِسی نوع کا طبقہ دراصل اُن کی اُمیدوں کا مرکز تھا۔ سماجی زندگی میں حالی نے متوسط طبقے کو بنیادی حیثیت دی ہے۔

قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اُسے
کیونکہ اس کے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر
دم سے وابستہ ہے ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام
قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جان آتی ہے مردوں میں وہ طاقت ہے یہی(۳)

حالی کے سماجی اصلاحات یا اُن کے دیگر افکار و تصورات کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانی قومیت کا وہ جذبہ جس شروع شروع میں اُن سے ''حبِ وطن'' جیسی نظم لکھوائی تھی ختم تو نہیں ہو سکا لیکن مسلم قومیت کے زیرِ اثر دب ضرور گیا۔ ۱۸۷۴ء میں حبِ وطن کی تصنیف کے بعد ہم انہیں زیادہ مسلمانوں ہی کے مسائل میں منہمک پاتے ہیں لیکن مسلمہ طور پر وہ مسلمانوں کے شاعرِ مدوجزرِ اسلام لکھنے کے بعد ہی بنے۔ اسی طرح شکوہ ہند میں بھی مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کا احساس بڑی شدّت سے کارفرما ہے۔

ب۔ موضوعاتی نظموں میں مسلم قومیت کا شعور

قوم اور وطن کا درد حالی کے دل میں قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھر رکھا تھا۔ جس دل سوزی کے ساتھ اُس نے قوم اور وطن کے راگ کو الاپا اس کی مثال اُردو شاعری میں نہیں ملتی ۔ حالی کا نام اگر زندہ جاوید رہے گا تو اِسی قومی شاعری کی بدولت، اُن نوحوں کی بدولت جو قوم کی خستہ حالی پر اُس نے بلند کئے۔ سرسید سے ملاقات کے بعد غزل اور قصیدوں کو چھوڑ کر حالی کی تمام تر توجہ قومی شاعری کی طرف ہو گئی تھی ۔

مولانا الطاف حسین حالی کی نظر میں مسلمانوں کی تباہی کا سبب یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں آ کر بعض ایسے طبعی اور تمدنی عوامل کا شکار ہو گئے جو یہاں برسرکار تھے

پر زمانہ میں رہیں گے تا قیامت یادگار
جو کئے برتاؤ تو نے ہم سے اے ہندوستان
ماجرا ہو گا ہمارا عبرت اوروں کے لئے
چیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستان
آگ سے رہتا ہے جیسے دور دور آتش پرست
حکمراں تیرے یونہی تجھ سے رہیں گے برکراں
برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہم سے پائیں گے بہت(۴)

شکوہ ہند میں بھی یہی تصور کارفرما ہے۔ نظم کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان جن خصوصیات کو لے کر یہاں وارد ہوئے تھے وہ رفتہ رفتہ یہاں کی آب وہوا میں ایسی مٹیں کہ اب اُن کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ حالی کو اس چیز کا شدید رنج تھا۔

ترکمانی صولت اور مغلی جلاوت ہم میں تھی

عزم کر دی ہم میں تھا بدوی حمیّت ہم میں تھی

ہاشمی آداب وعباسی فضائل ہم میں تھے

نطق اعرابی وعدنانی فضاحت ہم میں تھی

ضربِ کراری وحربِ خالدی رکھتے تھے ہم

سطوت حمزی وفاروقی جلالت ہم میں تھی

عرق غیرت تھی دلیل اپنی شرافت کی نہ مال

جھیپتی ہے جس دولت وشرافت ہم میں تھی

آج خاور تھا مقام اپنا توکل تھا باختیر

عیش وعشرت کی نہ فرصت تھی نہ عادت ہم میں تھی

ننگ تھا ہم کو مشقت سے نہ مزدوری سے علم

جو بزرگی تھی مشقت کی بدولت ہم میں تھی

ہم شتربانی سے پہنچے تھے جہاں بانی تلک

اس لئے باقی شتر بانوں کی خصلت ہم میں نہ تھی

جو نشان اقبال مندی کے ہیں وہ سب ہم میں تھے

حبِ دینی ہم میں تھاقومی مؤدت ہم میں تھی

گھر ہمارے اور ہم سب وقف مہمانوں پہ تھے

یثربی مہمان نوازی اور ضیافت ہم میں تھی

پھوٹ سے واقف نہ تھے ہم تیری اے ہندوستان

احمدی اخلاق واسلامی اخوت ہم میں تھی

چھین لی سب ہم سے یاں شانِ عرب آن عجم

تو نے اے غارت گر اقوام واکال الامم (۵)

ڈاکٹر غلام حسین کے مطابق:

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے شکوہ ہند پہلی نظم ہے جس کو باقاعدہ اور واضح طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصور کی اساس وبنیاد کہا جاسکتا ہے۔

تھی ہماری قوم وملت ،رسم و عادت سب جدا

رشتہ وپیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

بول چال اپنی الگ تھی اور زبان تیری الگ

تجھ ہم تھے اجنبی ،اور تو ہم سے ناآشنا(۶)

حالی یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ غلامی میں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ غالب قومیں مغلوب قوموں کو پامال کرنا اپنا حق تصور کرتی ہیں اور چونکہ غالب قوموں کا کردار ہمیشہ سے اسی نوعیت کا رہا ہے اس لئے موجودہ دور میں مغلوب کا غالب کے ہاتھوں برباد رہنا یقینی ہے نظم تحفتہ الاخوان میں فرماتے ہیں۔

حق ہے غالب کا کہ کچلے اور دلے مغلوب کو

ہے یہی مغلوب ہونے کا مآل انجامِ کار

کرتے آئے ہیں سب اپنی اپنی باری یہی

اور یہی جاری رہے گا دور تازہ وشمار

قوم کا درجہ سے گر جانا ہے اپنے وہ گناہ

مرتکب جس کا نہیں بچتا سزا سے زینہار(۷)

مولانا الطاف حسین حالی کی نظم حبِ وطن اپنے وطن اور قوم سے محبت کے جذبات سے بھر پور نظم ہے۔ اس نظم میں وطن سے محبت کو انہوں نے محض جذباتی انداز میں بیان نہیں کیا بلکہ اس محبت کو تاریخ کے مختلف حوالوں سے بھی ثابت کیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنی قوم اور اپنے وطن سے محبت انسان کو فطری جذبہ ہے۔ انسان جس خطے میں اور جس مقام پر پیدا ہوتا ہے اور وہاں زندگی گزارتا ہے، وہ خطہ اور وہ مقام اس کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ اُسی میں وہ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اپنے ہی وطن کی مٹی، دریا، پہاڑ، میدان، درخت اور پھل پھول انسان کو بھلے لگتے ہیں۔ اگر جنگ، سیلاب، زلزلہ یا کسی اور وجہ سے اسے اپنے وطن سے نکلنا پڑے تو وہ بوجھل دل کے ساتھ نکل تو جاتا ہے لیکن اپنے وطن کی یادیں ساری عمر اُس کو ستاتی رہتی ہیں۔ انسان جس وطن میں زندگی گزارتا ہے اُس کی ہر چیز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اس کو اپنا محسوس ہوتا ہے۔ یہ اپنائیت اور محبت مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مذکورہ نظم میں مختلف حوالوں اور مثالوں سے نمایاں کی ہے۔

نظم کے ابتدا میں انہوں نے کئی فطری مناظر جیسے گلزار، پہاڑ، ہوا، عنادل، چاند اور ستارے وغیرہ کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تم مجھے اب بھی عزیز ہو مگر اپنے وطن میں تمہاری قدر و قیمت اور تم سے اپنائیت کچھ زیادہ ہی تھی۔

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز

تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

حبِ وطن میں ہمارا تھا رمنا

تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کا ساماں تھے

تم مرے دردِدل کا درماں تھے(۸)

وطن سے دور کی حالت اور کیفیت حالی نے یوں بیان کی ہے کہ اب گلوں کی ادا اور بلبلوں کی صدا سے جی خوش نہیں ہوتا۔ باغ کی سیر اور چاندنی رات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی بلکہ وہ وبالِ جان بن گئے ہیں ۔ پہاڑ ،صحرا اور دریا کے حسین مناظر مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے ۔ وطن کی اہمیت اور قدر و قیمت کو مختلف حوالوں سے نمایاں کرنے کے بعد حالی نے کچھ اہم تاریخی حوالوں سے بھی حبِ وطن کو خوب نمایاں کیا ہے۔

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے

نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے

سیر گلشن ہے جی اک جنجال

شب مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ وصحرا تالب دریا

جس طرف جائیں جی نہیں لگتا(۹)

دوسری جگہ حالی فرماتے ہیں۔

اے وطن اے مرے بہشت بریں

کیا ہوئے تیرے آسمان وزمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا

وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا(۱۰)

جب جنوبی ایشا سے آریہ قبائل ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں کی مقامی آبادیوں پر حملے کیے اور اُن کے وطن پر قبضہ جمایا تو مقامی اقوام وقبائل نے اُن کے ماتحت غلام بن کر زندگی گزارنا قبول کیا لیکن اپنا وطن نہیں چھوڑا

۔حالی نے آریوں کی آمد کو یوں بیان کیا ہے۔

حملہ جب قوم آریا نے کیا
اور بجا ان کا ہند میں ڈنکا
ملک والے بہت سے کام آئے
جو بچے وہ غلام کہلائے (۱۱)

ان غلاموں کو شدر اور راکشس کے ناموں سے یاد کیا گیا۔ ان کو کمتر سماجی درجہ دیا گیا مگر وہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور نہ ہوئے کیونکہ اپنے وطن میں رہنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔

شدر کہلائے داکشس کہلائے
رنج پر دیس کے مگر نہ اٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبہ
نہ چھٹا ان سے دیس پر نہ چھٹا(۱۲)

نظم میں آگے جا کر مولانا الطاف حسین حالی نے ہندومت کے بانی رام چندر کا ذکر کرتے کیا ہے کہ جب بھگوان کی قربت حاصل کرنے کی خاطر وطن سے نکلے اور دور کے علاقوں میں مقیم ہوئے تو وطن کی یاد اُن دل سے بھی نہیں نکلی۔ اُن کو اپنا علاقہ ایودھیا یاد آتا رہا

جب ملا رام چندر کو بن باس
اور نکلا وطن سے ہو کے اداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر
پر چلا ساتھ لے کے داغِ جگر

پاؤں اٹھتا تھا اُس کا بن کی طرف
اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گزرے غربت میں اس قدر مہ وسال
پر نہ بھولا ایودھیا کا خیال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا
دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آکے لگتا تھا
آتی تھی جب ایودھیا کی ہوا(۱۳)

یہ ساری بحث غیر مسلم اقوام کی تھی کہ کس طرح اُن کے دل میں وطن کی محبت اس طرح ہوتی ہے اب وہ مسلم قوم کی حب وطن کی وضاحت کرتے ہیں کہ ابتدائے اسلام کے حالات واقعات کس طرح تھے کہ جب نبی کریم ﷺ کو خدا کی جانب سے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنے کا حکم ملا تو صحابہ کرامؓ نے بھی اپنے نبی ﷺ کی پیروی کی اور مکہ چھوڑ کر مدینہ جا کر آباد ہونے لگے۔ مدینہ میں اُن کو امن اور سکون کی زندگی نصیب ہوئی ۔ اُن کے سروں پر نبی کریم ﷺ کا سایہ بھی تھا مگر اس کے باوجود اُن کو اپنا آبائی وطن یاد آتا تھا۔ اس صورت حال کو مولانا الطاف حسین حالی نے یوں بیان کیا ہے۔

ہوئے جب یثرب کی جانب راہی
سید ابطحیؐ کے ہم راہی
رشتے الفت کے سارے توڑ چلے

اور وطن کو بالکل چھوڑ چلے

گو وطن سے چلے تھے ہوکے خفا

پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا

دل لگی کے بہت ملے سامان

پر نہ بھولے وطن کے ریگستان

دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے

سنگریزے زمین بطحا کے(۱۴)

وطن کی اہمیت کو مزید نمایاں کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی نے چند جانوروں اور پودوں کی پیش کی ہیں۔ کہتے ہیں ہر پودے کا بھی ایک وطن ہوتا ہے۔ اسی میں وہ خوب پھلتا پھولتا ہے۔ مثلاً آم کا درخت کابل میں نہیں پھلتا، جب کہ کابل کا انار ہند میں نہیں لگتا۔ مچھلی کا بھی ایک وطن اور ماحول ہوتا ہے۔ پانی کے ماحول اُس کو نکالا جائے تو مرجاتی ہے۔ اسی طرح سمندر نام ایک کیڑا آگ کے اندر زندہ رہتا ہے اگر اُس کو آگ سے نکالا جائے تو مرجاتا ہے۔ جانوروں کو دیکھیے گھوڑا، گائے، بھینس، اونٹ اور بکری اپنے اپنے ٹھکانے میں خوش رہتی ہے۔

اس میں انسان سے کم نہیں ہیں درند

اس سے خالی نہیں چرند وپرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں

سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا

کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آکے کابل سے یاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بارورزنہار
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
آگ سے جب ہوا سمندردور
اس کو جینے کا پھر نہیں ہے مقدور
گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے لالے اُن کو پڑتے ہیں
گائے، بھینس اونٹ ہو یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہے سبھی (۱۵)

ان مثالوں کے بعد مولانا الطاف حسین حالی مسلم قوم جو اُن کی اہلِ وطن بھی ہے اُس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے اہلِ وطن کو یعنی مسلمانوں کو اپنا دوست بناؤ۔ اُن کے کام آؤ۔ یہی زندگی کا مقصد ہے۔ اہلِ وطن کے بغیر کھانے پینے میں بھی کوئی مزہ نہیں آتا۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تم کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ(۱۶)

اس کے بعد حالی وطن کی محبت میں اتنے شدید نظر آتے ہیں کہ وہ مسلم قوم کو چھوڑ کر دوسری اقوام سے محبت کا

درس دیتے نظر آتے ہیں۔ اہلِ وطن سے محبت اور ہمدردی اور بھائی چارے کے سلسلے میں اُنہوں نے مذاہب کی شرط بھی نہیں رکھی وہ انسانیت کی بنیاد پر ایک معاشرے میں بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔ کوئی مسلمان ہو یا ہندو، بدھ مت کا ماننے والا ہو یا برہمن ہو، جعفری ہو یا حنفی مسلک کا ہو، جین ازم کا پیروکار ہو یا ویشنو مذہب کا ماننے والا ہو۔ سب کو اکرام کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے

ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہو وے یا کہ ہو حنفی
جین مت ہووے یا ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو(۱۷)

مولانا الطاف حسین حالی اہلِ وطن کے بغیر زندگی کو ایک آزمائش سمجھتے ہیں

دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک
کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ
ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بیزار(۱۸)

مولانا الطاف حسین حالی اپنی نظم حبِ وطن میں مسلم قوم کا کم ہی ذکر کیا ہے کیونکہ یہ نظم انہوں نے

ہندوستان کے بارے میں لکھی ہے اور ساری اقوام کا اس میں ذکر کیا ہے لیکن اس کے باوجود مسلم قوم کی جو خصوصیات ہیں اُن کو واضح طور پر بیان کیا ہے

جاگنے والے غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم وگوش اگر
لو جو لی جائے کورو کر کی خبر
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو
لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو(۱۹)

اس کے بعد مولانا الطاف حسین حالی اپنے ہم وطنوں کو باہمی اتفاق واتحاد کا درس دیتے ہیں اس میں بھی وہ مسلم قوم کے علاوہ پورے ہندوستان میں جتنی اقوام ہیں اُن سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کیونکہ اتفاق واتحاد ہی سے ایک وطن میں امن، سکون اور خوشحالی ممکن ہے۔ بیرونی طاقتوں سے بھی محفوظ رہنے کے لیے اتفاق واتحاد کی ضرورت ہے۔ اگر ہند کے لوگوں میں اتفاق واتحاد قائم رہتا تو بیرونی اقوام آکر ہند پر اپنا تسلط قائم نہ کرتیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اس سلسلے میں ہند پر حکمرانی والوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ تورانی، درانی، نادر شاہ۔ محمود غزنوی اور انگریز قوم کی آمد اور یہاں حکمرانی کرنے کو ان اشعار میں نمایاں کیا ہے۔

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتلِ عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا

سب سے آخر کو لے گئی بازی

ایک شائستہ قوم مغرب کی (۲۰)

ان اشعار میں حالی نے مسلم قوم کی طرف سے جو ہندوستان کو نقصان ہوا ہے وہ بیان کیا ہے مسلمان حکمرانوں نے اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے جو خون ریزی کی ہے اسلام اُس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا ہے اور آخر میں مسلم حکمران اور انگریز حکمران کا موازنہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا الطاف حسین حالی مسلم قوم اور دوسری اقوام کہتے ہیں کہ یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ تمہیں ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے ورنہ تم بھی وہی کچھ کرتے جو کچھ دوسرے حکمرانوں نے کیا ہے۔

یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام

کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام

ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم

پڑتی جو سر پہ وہ اُٹھاتے تم (۲۱)

اس شعر میں مولانا الطاف حسین حالی مسلم قوم سے فرما رہے ہیں کہ تم کو ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے کہ جو اصولوں کی پاسداری کرتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے ورنہ کوئی اور قوم ہوتی تو تمہارے لیے بہت بڑے نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔ مغربی قوم کے آنے کی وجہ سے یہاں ترقی کے مواقع پیدا ہوئے ہیں اب تمہاری ہمت ہے کہ اس قوم سے تم جتنا فائدہ اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو، اگر کوئی اور قوم سے واسطہ تمہارا پڑتا تو تم کو بہت ساری تکالیف اُٹھانی پڑ سکتی تھیں۔

اس کے بعد مولانا الطاف حسین حالی مسلم قوم اور اپنے ہم وطنوں کی عادات واطوار کو بیان کیا ہے اور اس بات پر دکھ کا اظہار کیا ہے کہ پیارے وطن میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے جن کو دوسرے ہم وطنوں کا خیال ہو۔ لوگ اپنی عیش وعشرت میں گم ہیں اور دوسرے ننگے بھوکے لوگوں کا کچھ خیال نہیں ہے۔

قوم سے جو تمہارے برتاؤ

سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ

اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا

کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا

شہر میں قحط کی دہائی ہے

جان عالم لبوں پر آئی ہے

بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں

رو کے ماں باپ کو رُلاتے ہیں

کوئی پھرتا ہے مانگتا دردر

ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر

پر جو ہیں ان میں صاحب مقدور

ان میں گنتی کے ہوں گے ایسے غیور(۲۲)

مولانا الطاف حسین حالی اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ عالم، فاضل لوگ بھی ایک دوسرے سے عناد رکھتے ہیں یہ صرف مسلم قوم کا حال نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے پنڈت آپس میں فتنہ وفساد میں مبتلا ہیں۔ وطن کے حکماء اور طبیب آپس میں نوک جھوک کر رہے ہیں۔ ان میں اتفاق و اتحاد نہیں ہے۔ اہلِ علم علمی انداز میں بحث ومباحث کے بجائے پہلوانوں کی طرح آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ ان حالات کا حالی نے اپنی مسلم قوم اور باقی اقوام کا اپنی شاعری میں یوں نقشہ کھینچا ہے۔

اہلِ دولت کا سن چکے تم حال

اب سنو روئیداد اہلِ کمال

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد

پنڈوتوں میں پڑے ہوئے فساد

ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا

ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا

رہنے دو اہلِ علم ہیں اس طرح

پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح (۲۳)

مولانا الطاف حسین حالی نے اس کے بعد جدید تعلیم اور تعلیم یافتہ افراد پر بھی تنقید کی ہے۔ اُن کے سماجی کردار کو قابلِ افسوس قرار دیا ہے۔ کیونکہ حالی کے خیال میں نئی نسل نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی تعلیم حاصل کر لی ہے اور وطن سے محبت کا دم بھی بھرتے ہیں لیکن حقیقت میں اُن میں وطن اور قوم کی محبت کے جذبات کم ہیں۔ قوم کو اُن سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں لیکن اُن کی تعلیم کا قوم کو کوئی خاطر خواہ فائدی نہیں ہوا ہے۔

تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے

خواہ بی اے ہوں اس میں یا ایم اے

پھرتے حبِ وطن کا گودم ہیں

پر محبِ وطن بہت کم ہیں

قوم کو اُن سے جو اُمیدیں تھی

اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں (۲۴)

مولانا الطاف حسین حالی مسلم قوم اور دوسری اقوام کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان تو تعلیم کے

میدان میں بہت پیچھے ہیں لیکن جو دوسرے لوگ ہیں اُنہوں نے نئے نئے مضامین میں جیسے ہسٹری اور جغرافیہ پڑھا ہے وہ اِن ہی کے کام آ رہا ہے۔ یہ علوم اُنہوں نے اپنے قبضے میں رکھے ہوئے ہیں اور دوسروں کو سکھانے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ اُن کے خیال ہے کہ اگر علم کو پھیلایا جائے تو ہندوستان بھی انگلستان کی طرح ترقی کر سکتا ہے۔ اس ساری صورتحال کو حالی نے بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔

ہسٹری اُن کی اور جیو گرفی
سات پردے میں منہ دیے ہے پڑی
بند اس قفل میں ہے علم اُن کا
جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا
لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے(۲۵)

مولانا الطاف حسین حالی آخر میں یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف مسلمانوں کی یہ حالت نہیں ہے بلکہ جتنی بھی اقوام ہندوستان میں بستی ہیں اُن سب کا یہی حال ہے وہ اخلاقی طور پر بھی کمزور ہیں اور معاشی طور پر بھی۔ اس سب کے باوجود حالی کہتے ہیں کہ اگر ہم ان کمزوریوں کو دور کر لیں تو ہم بھی پیرس اور لندن کی طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ اُن لوگوں نے دن رات محنت کی۔ مدرسے کھولے۔ کلب قائم کیے۔ حکمت اور ادب کے ادارے قائم کیے۔ ہر حکیم یہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسا نسخہ ہاتھ آئے جس سے میرے وطن کے لوگوں کی بیماری ختم ہو جائے۔ سیاحوں نے سختیاں جھیلیں اور یہ ساری چیزیں اپنے سفرناموں میں محفوظ کر کے اپنی قوم کی راہنمائی کی۔ حالی بھی اپنی مسلم قوم کو بالخصوص اور ہندوستان کی دوسری اقوام کو بالعموم یہی درس دیتے ہیں کہ اگر آپ بھی ایسی ترقی چاہتے ہو تو تمہیں بھی ایسی محنت کرنا پڑی گی۔

قوم پر اگر کرتے ہو احساں

تو دکھاؤ کچھ اپنا جوشِ نہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو
پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو
علم کو کر دو کو بہ کو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں (۲۶)

مولانا الطاف حسین حالی کی پوری نظم حبِ وطن وطن کی محبت سے عبارت ہے۔ اس میں انہوں نے مسلم قوم اور دیگر غیر مسلم اقوام کو جھنجھوڑا ہے۔ انہوں نے بہت درمندی کے ساتھ اپنے اہلِ وطن کو اپنے وطن اور وطن والوں سے محبت کرنے کا درس دیا ہے۔ اس نظم میں حالی نے مسلم قوم کی جو خصوصیات ہیں اُن کو بھی بیان کیا ہے کہ مسلمان خود تو بھوکا رہ سکتا ہے لیکن وہ دوسرے کو بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح تعلیم و تربیت جو مسلم قوم کی بنیادی ذمہ داری ہے جس کی وجہ سے معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اِس طرف بھی حالی نے توجہ دلائی ہے۔ مولانا الطاف حسین مسلم قوم کی ایک اور خوبی بیان کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی قوم کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے وہ اولاد، مال، جان سب کچھ لٹانے کے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ یہ ساری خصوصیات جو مسلم قوم کی ہیں حالی نے اپنی نظم میں اُن کو اِس طرح بیان کیا ہے۔

قوم پر سے نثار ہو اولاد
بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں
تو اگر مال دے تو میں دوں جاں
اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں
ہم وطن فائدے اُٹھاتے ہیں

کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری

دخل اور خرج جن کے ہیں بھاری

اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم

مبحث حکمت اور ادب قائم

نت نئے کھلتے ہیں دواخانے

بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے (۲۷)

آخر میں مولانا الطاف حسین حالی مسلم قوم اور دیگر اقوام سے کہتے ہیں کہ اے میرے ہم وطنوں اگر تم عزت چاہتے ہو تو اپنے بھائیوں کو عزت دو کیونکہ اُن کی عزت تمہاری عزت ہے اُن کی ذلت تمہاری ذلت ہے جو انسان اپنی قوم کی خدمت کرتا ہے حقیقت میں وہ سلطان ہے وہ چاہے جس قوم سے ہو۔ آخر میں حالی اپنی اس بات پر نظم کا اختتام کرتے ہیں کہ جتنی اچھی باتیں تھیں میں نے آپ کو بتادیں ہیں اب اُن پر عمل کرنا آپ کا کام ہے۔

گر رہا چاہتے ہو عزت سے

بھائیوں کو نکالو ذلت سے

ان کی عزت تمہاری عزت ہے

ان کی ذلت تمہاری ذلت ہے

قوم کا مبتذل ہے جو انساں

بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں

قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز

ہے فقیری میں بھی وہ بااعزاز

عزت قوم چاہتے ہو اگر

جا کے پھیلاؤ اُن میں علم و ہنر
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا(۲۸)

حوالہ جات

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، کلیات نظمِ حالی ،عزیزی پریس آگرہ جنوری ۱۹۲۴ء ص ۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۳۶

۳۔ ایضاً، ص ۸

۴۔ ایضاً، ص ۵۵

۵۔ ایضاً، ص ۲۷

۶۔ ایضاً، ص ۳۸

۷۔ ایضاً، ص ۹۵

۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۸۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۷۔ ایضاً،ص۴۲

۱۸۔ ایضاً،ص۵۶

۱۹۔ ایضاً،ص۸۷

۲۰۔ ایضاً،ص۹۹

۲۱۔ ایضاً،ص۲۲

۲۲۔ ایضاً،ص۴۴

۲۳۔ ایضاً،ص۸۰

۲۴۔ ایضاً،ص۷۶

۲۵۔ ایضاً،ص۶۷

۲۶۔ ایضاً،ص۳۴

۲۷۔ ایضاً،ص۸

۲۸۔ ایضاً،ص۳۰

ماحصل

ادب کا قوم کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ادب قوم اور سماج ہی سے جنم لیتا ہے اور سماج ہی کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔ ادب کا اصل منصب یہ ہے کہ جہاں وہ پڑھے لکھے طبقے میں ذوقِ ادب پیدا کرتا ہے وہیں وہ پسماندہ اور پسے ہوئے استحصال زدہ طبقے کو کھڑا ہوانے اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی تیار کرتا ہے اور ایک بہتر مستقبل کا خواب ہی نہیں بلکہ امید کو بھی جنم دیتا ہے جو ادب کی سب سے بڑی کاوش ہے۔ معاشرے کی تعمیر میں ادب کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاعری میں اسلامی تہذیب وثقافت اور مسلم قومیت کے نقوش تلاش کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ برصغیر میں اسلامی تہذیب وثقافت اور مسلم قومیت کی صورت حال کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک ہمہ گیر اور آفاقی مذہب ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دیارِ حرم سے نکل کر جن راستوں سے گزرا اور جن بستیوں میں ٹھہرا وہاں کی تہذیبی روایات، وہاں کی معاشرت اور وہاں کی صالح اقدار کو اپنے آپ میں اس طرح ضم کرتا رہا کہ دیارِ غیر کے مناظر بھی سرسبز شاداب ہوگئے۔ ظاہر ہے اس کا اطلاق سرزمینِ ہند پر بھی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی مسلم ثقافت کے طاق پر یونانی علم وحکمت کے چراغ بھی روشن ہیں اور آریائی فکر وفلسفے کی تصاویر بھی نمایاں ہیں۔ جہاں تک اردو شعر وادب کا تعلق ہے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو شعریات پر تلمیحات پر اور استعارات پر جو قرینہ نظر آتا ہے وہ یقیناً فارسی شاعری ہی مستعار ہے، لیکن اس پورے منظر نامے میں مذہب یا دین جس سے انسان کا ازلی رشتہ ہے، اس کا پرتو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ شعر وادب کا ایک مقصد دین ومذہب کی عطا کردہ اقدار کی بنیادوں پر انسان سازی کرنا بھی ہے اور مشرقی شاعری نے اس فریضے کو اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا ہے۔ اس عظیم مقصد کا بیڑا اٹھانے والوں میں ایک نام مولانا الطاف حسین حالی کا بھی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی اپنے مزاج کے اعتبار سے علی گڑھ تحریک کے مقاصد سے ہم آہنگ تھے، اس لیے سب سے زیادہ مفید بھی وہی ثابت ہوئے۔ وہ ایک نقاد کا دل ودماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حسن وتناسب کی پرکھ، شدتِ احساس، دردِ دل کی نعمت، تخیل کی تیزی اور مشاہدے کی گہرائی، وہ خصوصیات تھیں جو فطرت نے فیاضی کے

ساتھ اُن کو ودیعت کی تھیں ۔ بچپن ہی سے رنج ومصائب سے دوچار ہونے کے سبب اُن کے دل میں سوز وگداز پیدا ہو چکا تھا۔ حالی کی شاعری میں سادگی ، اصلیت اور حقیقت کا عنصر نظر آتا ہے۔ وہ جذبات واحساسات کو اس ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں دل کی سچی لگن اور دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کے نتیجے میں ہندوستان اور مسلمانوں کی بربادی مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی ۔ اس دور میں ملک وقوم کی بدحالی و پریشانی بدامنی وانتشار و بے چینی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ساتھ ہی لوگوں پر جمود اور بے حسی، شکست ومایوسی طاری تھی لیکن خدا کے کچھ بندے ایسے بھی تھے، جنہوں نے اس طوفانِ مصیبت کے سامنے ہمت اور ہوش کے ہتھیار نہیں ڈالے، بلکہ حالات کا مقابلہ قلم سے کرنے کی کوشش کی اس کوشش میں سب سے نمایاں جو نام ہمیں نظر آتا ہے دنیا اُس کو سرسید احمد خان کے نام سے جانتی ہے۔ سرسید نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے، جس میں مغربی علوم سیکھے بغیر کام نہیں چلے گا ۔ اگر لوگوں نے زمانے کا ساتھ نہ دیا تو مزید برباد ہو جائیں گے ۔ سرسید نے علی گڑھ سکول وکالج قائم کیے جو ایک تحریک بنے ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اس تحریک میں سرسید کا ساتھ دیا۔

مولانا الطاف حسین حالی بہت بڑے عالم دانشور اور مفکر تھے، انہوں نے سرسید کے کہنے پر ایک مسدس (مدوجزرِ اسلام) لکھی جو مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہے اور حالی کی شناخت کا علمی حوالہ ہے۔ مسدسِ حالی اردو کی قومی شاعری کا سنگِ بنیاد تھا۔ حالی سرسید کے مشن میں برابر کے شریک ہو گئے اور انہوں نے اپنی شاعری کو قومی خدمت کے وقف کر دی ۔ قومی خدمت کا تصور حالی کے ذہن میں یہ تھا کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کی تائید کر کے قوم کو تعلیم کی طرف توجہ دلائیں۔ جہالت کی تاریکی دور کریں اور لوگوں کو معاشرتی اور معاشی اصلاح کی ضرورت کا احساس دلائیں تاکہ وہ زمانے کے تقاضے اور مطالبے کو سمجھیں اور اس کو پورا کریں ۔ اس سلسلے میں حالی نے بہت ساری نظمیں اور مثنویاں لکھیں۔ ان سب کی تہہ میں یہی جذبہ اور روح کارفرما ہے۔

تاریخ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ شعرا نے اپنے جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے شعر کے ذریعے اصلاحِ قوم کا بھیڑا اٹھایا۔ انہوں نے شعر کو دادِ سخن اور واہ واہ حاصل

کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کے لیے استعمال کیا۔

حالی نے مسدس میں ظہورِ اسلام ، اسلام کی وہ روشنی جو عرب میں پھیلی ، اسلام کا عروج ، اسلامی تہذیب وثقافت کی عظمت وشوکت اور اُس کے باقیات الصالحات ، ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی ، دوسری اقوام کی کامیابیاں اور اُن کے اسباب اور پھر مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیے تجاویز کو بڑے مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ مسدس اور اس کے بعد اکثر نظموں میں حالی نے قومی دکھڑے ہی کو موضوعِ خاص بنایا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ''مدوجزرِ اسلام'' میں اپنی قوم کو اس کے عظیم الشان ماضی کا آئینہ دکھایا ہے جہاں شوکت وعظمت بھی تھی اور اقتدار اقبال بھی تھی ، دولت وثروت بھی تھی اور علم وہنر بھی۔

ایک ماہر طبیب کی طرح حالی نہ صرف قوم کا مرض دریافت کرتے ہیں بلکہ اس کا علاج بھی بتا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے اوپر پڑنے والی ہر مشکل کا حل تمھارے پاس ہے۔ اگر ہم سے کام لو گے تو تقدیر بھی تمہارا ساتھ دے گی اور خدا بھی تمھارا حامی ناصر ہوگا۔

مولانا الطاف حسین حالی بنیادی طور پر ایک فرشتہ سیرت انسان تھے۔ اُن کی ذات میں ان بہترین خوبیوں کا اظہار ہوا ہے جو انسانیت کے لیے باعث شرف ہیں۔ حالی کی تصویر میں ایک شاعر ، ایک معلم ، ایک نقاد ، ایک مورخ ، ایک سیاست دان اور ایک مصلح قوم کے خدوخال نمایاں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں تحرک وارتعاش پیدا کرنے اور اس کی تہذیبی جہتوں کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور ہندوستان کے مسلمانوں میں آزادی اور جداگانہ قومیت کے تصورات کی تشکیل میں اوّلین حصہ حالی کا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کا عرصہ ہماری تہذیبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ حالی نے اس تہذیب ومعاشرت میں آنکھ کھولی تھی جو قدیم جاگیردای نظام کی پیداوار تھی۔ قدرتی طور پر انھیں اسی نظامِ حکومت سے لگاؤ ہو چاہیے لیکن انہوں نے عام مسلمانوں کی طرح جذباتی رو میں بہنا پسند نہ کیا۔

حالی ایک طرف مغربی تہذیب کو دیکھتے ہیں جو دنیاوی طریقوں کی علم بردار ہے دوسری طرف مسلم تہذیب ہے جو جاگیری نظام کے خلاف اور عدل ومساوات کا درس دیتی ہے۔ حالی کے نزدیک مسلم تہذیب ایک عالم گیر

تہذیب ہے اور یہ تہذیب اپنی خصوصیات کی بنا پر دوسری تمام تہذیبوں سے اچھی تہذیب ہے ۔ مسدس میں وہ اُس زمانے کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں جب مسلمانوں نے پہلے پہل ترقی کے میدان میں قدم اٹھایا ۔ اس وقت ان تمام تہذیبوں کا شیرازہ بکھیر دیا اور مسلم تہذیب غالب آئی حالی جو مسیحائے قوم بن کر آئے تھے انہوں نے اپنی اس شاہکار نظم کو اپنے خونِ جگر سے لکھا۔ یہ نظم پہلی قومی نظم ہے، اسے مسلمان قوم کے عروج کی کہانی اور زوال کا مرثیہ یا سرسید احمد خان کے الفاظ میں قوم کے حال کے آئینہ اور تاریخ کا مرثیہ کہنا چاہیے۔ اس نظم میں حالی نے مشترکہ قومی مسائل کے بجائے صرف قومِ مسلم کو موضوع بنایا ہے اور قومی ادبار کی حقیقت پسندانہ تصویریں بنائی ہیں ۔ مسدس حالی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور مغلوبیت ، دوسری اقوام کی کامیابیاں اور ان کے اسباب اور پھر مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیئے تجاویز کو بڑے مربوط انداز میں پیش کیا ہے

مولانا الطاف حسین حالی کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگی ، اصلیت ، جوش، حقیقت پسندی ہیں، لیکن اندازِ بیان کی سادگی کے باوجود اُن کے ہاں درد واثر کی کمی نہیں ۔ حالی کا کلام قوم کے نام ایک حیات بخش پیام ہے

۔انہوں نے برصغیر میں پستی ہوئی امتِ مسلم کو دیکھ کر اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی اس قوم کی فلاح و بہبود کے لیے جہاں تک ممکن ہوسکا اپنا حصہ ڈالیں گے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلم قومیت کے تصور کو فروغ دیا اور بالخصوص مسدس حالی جیسی شہرہ آفاق نظم لکھ کر امتِ مسلم کے عروج و زوال کو نہ صرف انتہائی فن کاری کے ساتھ قلم بند کیا ہے بلکہ ہمیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے آشنا بھی کروایا ہے اور اس بات کو باور کروایا ہے کہ مسلم قومیت کا تصور اسلام کا عطا کردہ تصور ہے اور امتِ مسلم کی کامیابی بھی اس تصور میں پوشیدہ ہے۔

قوم اور وطن کا درد حالی کے دل میں قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھر رکھا تھا۔ جس دل سوزی کے ساتھ اُس نے قوم اور وطن کے راگ کو الاپا اس کی مثال اُردو شاعری میں نہیں ملتی ۔ حالی کا نام اگر زندہ جاوید رہے گا تو اِسی قومی شاعری کی بدولت ، اُن نوحوں کی بدولت جو قوم کی خستہ حالی پر اُس نے بلند کیئے ۔ سرسید سے ملاقات کے بعد غزل اور قصیدوں کو چھوڑ کر حالی کی تمام تر توجہ قومی شاعری کی طرف ہوگئی تھی ۔

مولانا الطاف حسین حالی کی نظر میں مسلمانوں کی تباہی کا سبب یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں آ کر بعض ایسے طبعی اور تمدنی عوامل کا شکار ہو گئے جو یہاں برسرکار تھے۔

کتابیات

☆ ابواعلیٰ مودودی سید، مسئلہ قومیت، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ۱۹۹۳ء

☆ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور۱۹۹۰ء

☆ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور۱۹۹۰ء

☆ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقیِ اردو کراچی۱۹۸۳ء

☆ آل احمد سرور، تاریخ ادب اردو، انجمنِ ترقی اردو کراچی۲۰۰۰ء

☆ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، نیا ادارہ لاہور۱۹۶۹ء

☆ جالبی جمیل، ڈاکٹر، تاریخِ ادب اردو، جلداوّل مجلسِ ترقیِ ادب لاہور۲۰۰۸ء

☆ اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،۱۹۸۴ء

☆ القرآن

☆ القرآن

☆ الحدیث

☆ گارساں دتاسی، مقالات گارساں دتاسی، ترجمہ، ڈاکٹر یوسف حسین خان، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، س ن

☆ جیلانی کامران، قومیت کی تشکیل اور اردو زبان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،۱۹۸۲ء، ص۱۹ ۷۔ص۱۱۳

☆ قائداعظم بحوالہ (تاریخ علی گڑھ)، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی،۱۹۸۱ء

☆ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر بحوالہ، خطبات سرسید، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۷۷ء

☆ قائداعظم بحوالہ ((تاریخ علی گڑھ)

☆ وحید قریشی، ڈاکٹر، اقبال اور پاکستانی قومیت، مکتبہ عالیہ، لاہور

☆ علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ برائے ایم اے اردو کوڈ نمبر ۶، یونٹ ۱۰۔۱۸، علامہ اقبال یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

☆ محمود الحسن، مولانا (مترجم)، القرآن الکریم، وزارت اوقاف، سعودی عرب، ۱۹۹۳ء

☆ ہارون الرشید، پروفیسر، اردو ادب اور اسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مکتبہ خیابان ادب لاہور، ۱۹۶۶ء

☆ خان سعادت اکبر خان، سیارہ (ماہنامہ) کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

☆ فروغ احمد پروفیسر، اسلامی ادب کی تحریک (مضمون)، مطبوعہ، سیارہ، لاہور ستمبر ۱۹۹۵ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۸۵ء

☆ محمد ایوب قادری، ڈاکٹر، اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع اول، ۱۹۸۸ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم

☆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد دوم

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

☆ آسی ضیائی، پروفیسر (مضمون)، اردو نثر کا ایک فراموش سنگ میل، مجموعہ، سیارہ، لاہور، جنوری ۱۹۹۳ء

☆ ابن فرید، ڈاکٹر (مقالہ)، اردو نثر میں دینی خدمات، مطبوعہ، ماہنامہ سیارہ، لاہور، جنوری ۱۹۹۳ء

☆ وحید قریشی، ڈاکٹر، اردو نثر کے میلانات، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۶ء

☆ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اردو ادب میں مشرق کی بازیافت، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور، مئی۔ جون ۱۹۸۵ء

☆ خورشید احمد، دینی ادب (مقالہ) مشمولہ، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء

☆ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اردو ادب میں مشرق کی بازیافت، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور، مئی۔ جون ۱۹۸۵ء

☆ ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر، اردو صحافت میں طنز و مزاح، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

☆ خورشید احمد، دینی ادب (مقالہ) مشمولہ، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند

☆ محمد اکرم شیخ، موج کوثر، فیروز سنز، لاہور۔ ۱۹۶۳ء

☆ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

☆ حمید احمد خان، پروفیسر، ارمغان حالی (مقدمہ)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۱ء

☆ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر

☆ فروغ احمد، پروفیسر، جدید اسلامی ادب کا تاریخی پس منظر، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور ۱۹۹۵ء

☆ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء

☆ ہارون الرشید، اردو ادب اور اسلام

☆ انجم نعیم، ادب کی تعمیری جہت، فرینڈز پبلی کیشنز، ملتان، س ن

☆ ابوالاعلیٰ مودودی، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۶ء

☆ شاہ ارشاد عثمانی، ڈاکٹر، مقالہ، تحریک ادب اسلامی کی افتاد، ایک مختصر جائزہ، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور، مئی ۱۹۹۰ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں

☆ فروغ احمد، پروفیسر، اسلامی ادب و صحافت، علم بردار رسائل و جرائد، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، ستمبر لاہور ۱۹۹۵ء

☆ محمد حسن عسکری (مضمون)، تاریخی شعور، مشمولہ، تخلیقی عمل اور اسلوب، مرتبہ محمد سہیل عمر، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۹ء

☆ آفتاب احمد، ڈاکٹر (شخصی خاکہ)، محمد حسن عسکری، مشمولہ، بیاد صحبت نازک خیالاں، مکتبہ دانیال، کراچی، دسمبر ۱۹۹۸ء

☆ فاروقی شمس الرحمن، ڈاکٹر، محمد حسن عسکری کے بارے میں، مطبوعہ، مکالمہ، کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۸، جولائی

۲۰۰۱ء، اکادمی بازیافت

☆ فروغ احمد، پروفیسر، اسلامی ادب۔ ۷۰۔ ۱۹۷۹ء، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء

☆ غلام حسین ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر

☆ عقیل معین الدین، ڈاکٹر (مضمون)، فروغ بادہ اقبال۔ ماہر القادری، مشمولہ، پاکستانی ادب مسائل ومنظر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء

☆ نعیم صدیقی، سواء السبیل۔ ایک تاثر، مطبوعہ ماہنامہ سیارہ، لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۸۵ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، مشتاق بک ڈپو۔ شیلڈرن روڈ۔ کراچی ۱۹۶۴ء

☆ الطاف حسین حالؔی، حیاتِ جاوید، لاہور ۱۹۸۶ء

☆ الطاف حسین حالؔی، مسدس حالی، مکتبہ خلیل لاہور ۲۰۰۵ء

☆ الطاف حسین حالؔی، مسدسِ حالی، الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۹ء

☆ الطاف حسین حالؔی، مسدسِ حالی، مکتبہ خلیل لاہور ۲۰۰۵ء

☆ الطاف حسین حالؔی، کلیات نظمِ حالی، عزیزی پریس آگرہ جنوری ۱۹۲۴ء

☆ الطاف حسین حالؔی، مجموعہ نظمِ حالی، گردوت ہاؤس لاہور جون ۱۹۲۹ء

☆ کامل قریشی، ڈاکٹر، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب مرتبہ: اردو اکادمی دھلی ۲۰۰۶ء

☆ سرسید احمد خان، مقالاتِ سرسید جلد دہم، مجلس ترقیِ ادب لاہور ۱۹۹۲ء

☆ سرسید احمد خان، ہماری تعلیم ہماری زبان میں، مشمولہ مقالاتِ سرسید حصہ ہشتم مجلس ترقیِ ادب لاہور ۱۹۹۱ء

☆ سید سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، عبداللہ روڈ، کراچی ۱۹۸۹ء ص ۱۳ آٹھواں ایڈیشن

☆ شبلی نعمانی، علامہ، سیرت النبی ﷺ جلد دوم، شمع بک ایجنسی لاہور ص ۴۷۵

☆ شمس الرحمٰن فاروقی، نوآبادیاتی شعریات اور ہم، مشمولہ دانش (آرٹس فیکلٹی جرنل)، شمارہ ۷ علی گڑھ

☆ شہزاد حسین، ہندوستان کا تمدنی ماحول، رنگ پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۵ء

☆ شیخ محمد اکرم، موجِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۲۰۰۳ء

☆ صالحہ عابدہ حسین، یادگارِ حالی، بک ٹاک لاہور ۲۰۰۷ء

☆ عبدالحق مولوی، سر سید احمد خان حالات و افکار، اردو مرکز، اردو بازار دھلی ۱۹۶۰ء

☆ عطاءاللہ شیخ، اقبال نامہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور طبع نو ۲۰۰۵ء

☆ قاضی جاوید، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقا، ادارہ ثقافت پاکستان ۱۲۹۔سی ماڈل ٹاؤن لاہور۔ طبع اوّل ۱۹۷۷

☆ کامل قریشی ڈاکٹر، اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مرتبہ، اردو کادمی دھلی، ۲۰۰۶ء

☆ محمد اسماعیل پانی پتی شیخ، خطباتِ سرسید، مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور طباعت دوم جون ۲۰۰۹ء

☆ محمد اکرام چغتائی، مضامینِ سرسید مرتبہ، سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء

☆ معین الدین عقیل ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مجلس ترقی ادب لاہور جون ۲۰۰۷ء

☆ مولوی عبدالحق، افکارِ سرسید، انجمن ترقی اردو پاکستان، انجمن پریس نشتر روڈ، کراچی ۱۹۷۹ء

☆ مولوی عبدالحق، افکارِ حالی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۹ء

☆ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، نوآبادیاتی صورتحال، مشمولہ ساختیات اور تنقید، پورپ اکادمی اسلام آباد ۲۰۰۹ء

LIBRARY ISLAMABAD